رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۵۳۴

رجب ۱۳۷۶ھ   جلد ۴۸ عدد ۱

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک ، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے   قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن

لاهور

فہرست مضامین

جلد ۴۸	رجب ۱۳۷۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

باسمہ تعالیٰ

اشارات

کسے خبر تھی کہ جس خطۂ پاک کو مال و جان، عزت و آبرو کی بے شمار قربانیوں کے عوض اسلام کے لیے تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا تھا وہ ایک نہایت ہی قلیل مدت میں فتنوں کی آماجگاہ بن جائے گا اور وہ سرزمین جس میں صرف اللہ کا حکم بلند ہونا تھا اُس میں شیطنت کے تند و تیز طوفان اٹھیں گے۔ جس شخص نے پاکستان کی مختصر سی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ فتنوں کا ایک لامتناہی چکر ہے جس میں ہر وہ فرد اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے جو مسلمان کی حیثیت سے یہاں زندہ رہنا چاہتا ہے اور ایمان کی دولت کے ساتھ دفن ہونے کی آرزو رکھتا ہے۔ یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ ہر شرکی محض اس لیے پشت پناہی کر رہا ہے کہ کسی طرح اسلام پر عرصۂ حیات تنگ ہو اور یہ دین اپنے گھر میں ہی اجنبی ہو کر رہ جائے۔ یہاں کفر و الحاد، فسق و فجور کو لوگوں پر مسلط کرنے کی مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں، یہاں صنفی بے راہ روی اور عیش و طرب کو فروغ دینے کے لیے سامان مہیا ہو رہے ہیں، یہاں خاندانی نظام پر، جو دراصل اسلامی اقدار کا مضبوط ترین حصار ہے ایک گہری سازش کے ساتھ تابڑ توڑ حملے کئے گئے۔ پھر اسی سرزمین میں نہ صرف قادیانیت کو پناہ حاصل ہوئی، بلکہ اسے شہ بھی ملی تاکہ وہ ملتِ اسلامیہ کے اندر انتشار پیدا کر سکے۔ یہاں فتنۂ انکارِ حدیث کی پوری پوری سرپرستی کر کے اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ کسی طرح اس قوم کے دل و دماغ سے اپنے ماضی کی عظیم الشان روایات کو محو کیا جائے، تاکہ اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے جہاز بے لنگر ہو کر بڑی آسانی کے ساتھ ان کے اُٹھائے ہوئے طوفانوں کی نذر ہو جائیں۔ اس سلسلہ کا ایک شاہکار یہ بھی ہے کہ جس بنیاد پر یہ ملک تقسیم ہوا تھا اسی بنیاد کو ہی مخلوط انتخابات کے ذریعہ منہدم کر دیا گیا ہے۔ فتنوں کی اس لمبی فہرست میں اب ایک تازہ اضافہ

"ضبطِ ولادت" کے فتنہ سے ہوا ہے، جسے یار لوگوں نے اپنی روایتی ہوشیاری کے ساتھ عائلی منصوبہ بندی کے "مقدس" نام سے پیش کیا ہے۔

اس فتنے کو اٹھانے کا ٹکنیک بھی وہی پرانا ہے یعنی ایک مسئلہ جو ہمارے ملک کے لیے کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا مگر جس سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جاسکتے ہیں اُسے بیٹھے بیٹھے محض ایک شوشہ کے طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے پھر اس کی نشر و اشاعت کے لیے پوری سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی ہے اور اس طرح اس کے گرد پراپیگنڈا کا طوفان اٹھا کر اپنے ناپاک عزائم کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

بالکل اسی انداز سے ضبط تولید کے فتنہ کو بھی اٹھایا جارہا ہے۔ یکایک لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ ملک کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور ذرائع پیداوار محدود ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو یہاں کے رہنے والے شدید مصائب سے دوچار ہوں گے۔ پھر اس کا خود ہی یہ حل بھی تجویز فرما دیا کہ اس مصیبت سے بچنے کی اگر کوئی صورت ممکن ہے تو صرف یہی ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ آبادی کو بڑھنے سے روک دیا جائے۔

یہ مسئلہ بظاہر بڑا نازک معلوم ہوتا ہے اور اس کے لیے جو حل پیش کیا گیا ہے وہ بھی سطح بین آنکھوں کو کافی معقول دکھائی دیتا ہے مگر وہ لوگ جن کے دل و دماغ جھوٹے پراپیگنڈا سے ماؤف نہیں ہوتے اور جن کی نگاہیں سطحی اور وقتی مسائل میں الجھ کر نہیں رہ جاتیں بلکہ حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مسئلہ کو اٹھانے کا مقصد بھی اسلام کے خلاف زمین ہموار کرنا ہے۔

آئیے اب ہم اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔

جو انسان بھی اس دنیا میں جنم لیتا ہے اُسے کھانے کے لیے خوراک، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا، سر چھپانے کے لیے مکان اور بیمار ہونے کی شکل میں علاج معالجہ کی ضرورت ہے۔ دنیا کا کوئی فرد بھی ایسا نہیں

جوان سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ اپنی ان روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ زندگی میں جدوجہد کرتا ہے اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو کام میں لاکر دولت کماتا ہے اور پھر اسے ان کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے۔ حیات انسانی کی یہ احتیاجات درحقیقت وہ زبردست محرکات ہیں جو ایک فرد کے اندر سعی و عمل کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

عمر کی ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد جب انسان اپنے آپ کو رشتہ مناکحت میں باندھتا ہے تو پھر اس کی ضروریات کا دائرہ بھی پھیلتا ہے۔ وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے کہ اپنے لیے ان ضروریات کو مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں اپنی رفیقہ حیات کے لیے بھی فراہم کرے۔ اس جذبہ سے اس کے اندر مزید محنت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے ہاں اولاد ہوتی ہے تو اس کی جدوجہد اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بیوی بچوں کی محبت اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے ذاتی آرام و آسائش کو قربان کر کے اپنے گھر والوں کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرے۔ خود دکھ جھیل لے مگر کسی طرح انہیں سکھ پہنچائے۔ یہ احساس نہ صرف انسانوں کو محنت و مشقت کی راہ پر لگاتا ہے بلکہ ان کے اندر ایثار، وسعت قلبی، تحمل ضبطِ نفس ایسی بلند صفات بھی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی مصلح قوم اس ملت کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم ضبط تولید کے ذریعہ اولاد کی افزائش کو روک دو تو وہ دراصل نہ صرف سعی و جدوجہد کے اس آخری محرک کو مٹاتا ہے جو اولاد کی محبت سے نوع انسانی کے سینے میں موجزن ہوتا ہے، بلکہ وہ انسانوں کے اندر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کی خود غرضانہ ذہنیت بھی پیدا کرتا ہے، جو آگے چل کر اس کے اندر اس احساس کو پرورش کرے گی کہ اسے دنیا کے سارے فوائد و لذائذ خود اپنے لیے سمیٹ لینے چاہئیں اور دوسروں کو اس سے محروم کر دینا چاہیے۔

پھر اولاد کی محبت ایک ایسی مقناطیسی قوت ہے جو میاں اور بیوی کو باہم ایک دوسرے سے زندگی بھر جوڑے رکھتی ہے۔ شہوانی جذبہ جس میں ایک قسم کی خود غرضی پائی جاتی ہے، اس میں یہ طاقت نہیں کہ ان دونوں کو تاحیات ایک دوسرے سے باندھ کر رکھے۔ نکاح کے بعد کچھ مدت تک تو یہ جذبہ بلاشبہ انہیں ایک دوسرے کے قریب رکھ سکتا ہے مگر یہ جلد ہی سرد پڑ جاتا ہے اور اس میں وہ جاذبیت باقی

نہیں رہتی کہ ان مائل بہ انتشار افراد کو ایک مسلک میں منسلک کر دے۔ اس وقت اولاد کی محبت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو انہیں منتشر نہیں ہونے دیتا۔ اس لیے جو لوگ اولاد کی ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں اور انفرادی عیش و آسائش میں مشغول رہنا چاہتے ہیں وہ دراصل خاندانی نظام کے لیے ایک عظیم خطرہ ہیں یورپ میں جس رفتار سے ضبط تولید کا گمراہ کن نظریہ پھیلا بالکل اسی رفتار کے ساتھ وہاں طلاقوں کی تعداد بھی بڑھی اور خاندانی نظام بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ اس صورت حال کی جو تصویر امریکہ کے ایک مشہور پروفیسر نے کھینچی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہم کھانا اب ہوٹلوں میں اور ریستوران میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے۔ کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں تفریح کے لیے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب اس کے لیے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون و آسائش تلاش کی جاتی تھی مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں۔ اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو ان کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکر معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں کہ خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گذرتا ہے۔ ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم بہرحال شب باش ہوں۔ شب باشی کا تو ذکر ہی کیا اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھروں میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے۔"

یہ تصور کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں بھی ایک نہایت ہی گمراہ کن نظریہ کی آبیاری کرتا ہے انسان کے ذہن میں یہ خیال آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگتا ہے کہ قدرت معاذ اللہ بڑی بخیل اور بے رحم ہے وہ ہر ذی روح کے ساتھ ایک شرمناک کھیل کھیلتی ہے۔ اس نے ایک ایسی زمین پر نسلوں کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا سامان کر دیا ہے جس میں ان نسلوں کو پالنے کے لیے کافی سامان نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی کو رزق کے ساتھ ساتھ رکھنے کے لیے قحط اور بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں۔ جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ قدرت کے لیے رحم دیوتا "دو دھڑے انسانوں کی اس تباہی بربادی کا

تماشہ بڑے فرحت و انبساط سے دیکھتے ہیں ۔ یہ نقطہ نظر انسانوں کے دل و دماغ میں خالق کائنات کے خلاف ایک نہایت ہی خوفناک بغاوت کی تخم ریزی کرتا ہے اور خدا کی خدائی میں انسان کے مستقبل کو سراسر تاریک دکھاتا ہے ۔

یورپ کی پچھلی چند سالوں کی تاریخ اس بات پر ایک زندہ شہادت ہے کہ قدرت کے خزانے بیحد و حساب ہیں، کوئی شخص بھی کسی منزل پر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فطرت نے اپنی بخشش سے ہاتھ روک لیا ہے جو فرد بھی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل حقیقت کا منہ چڑاتا ہے ۔ قدرت نے بلاشبہ اپنے خزائن کو تقسیم کرنے کا انتظام کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ انسان کے اندر ان کی طلب کے ساتھ سعی کا جذبہ بھی پیدا ہو، مگر اس نے اپنے دروازے کبھی اُن لوگوں پر بند نہیں کئے جنھوں نے انہیں کھٹکھٹانے کی ہمت کی۔

بر بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھا لے، ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یورپ — خصوصاً مغربی اور وسطی یورپ میں گذشتہ صدی سے آبادی حیرت انگیز رفتار کے ساتھ بڑھ رہی ہے ۔ مگر اسی نسبت سے وہاں طریق پیدائش کی نئی نئی گرہیں بھی کھلیں ۔ لوگوں نے زمین کے سینے کو چاک کر کے اناج کی اس قدر زیادہ مقدار حاصل کی کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس کا کبھی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کیا انگلستان کا معیار زندگی آبادی میں معتدبہ اضافہ کے باوجود گر گیا ہے ۔ کیا آج امریکہ اور روس میں خوراک کی کمی ہے ؟ کیا چین نے اپنی بلند ہمتی، محنت اور جفاکشی سے مالتھس کے نظریہ آبادی کو باطل نہیں کر دیا۔

جن ماہرین نے پاکستان کا ارضیاتی جائزہ لیا ہے اُن کا خیال ہے کہ قدرت نے اس ملک کے رہنے والوں کے ساتھ بڑی فیاضی کا سلوک کیا ہے ۔ قدرت کے یہ انمول عطیات زمین کی سلوٹوں میں منہ چھپائے اس بات کے سراپا منتظر ہیں کہ کوئی تیز اور متجسس نگاہ سطح زمین کے خارجی پردوں کو چیرتی ہوئی اُن تک پہنچے اور انہیں معلوم کرے اور پھر کوئی متحرک ہاتھ انہیں وہاں سے نکال کر استعمال میں لائے ۔ پاکستان کی اصل ضرورت اس وقت قدرت کے ان چھپے ہوئے عطیات کو معلوم کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ہے ۔ مگر

ہمارے یہ بہی خواہ ہمیں اس وقت کم ہمتی کا مشورہ دیتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ تم پیداوار اور وسائل زندگی میں اضافہ کرنے کی بجائے، اولاد میں کمی کر دو تاکہ جو کچھ اس وقت ذرائع ہیں وہی آبادی کے لیے کافی ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا صاف ارشاد ہے:

ولا تقتلوا اولادکم من املاق — اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر کی وجہ سے نہ قتل کرو۔ ہم

نحن نرزقکم وایاھم (الانعام رکوع ۱۹) — تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اس نظریہ نے انسان کے متعلق بھی ایک نہایت گھٹیا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی حیثیت اس کارخانہ حیات میں ایک عارضی و اتفاقی شئے کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ ان کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی ہے اسے اس مادی دنیا میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں وہ اس بات پر مجبور ہے کہ مادی دنیا کے وسیع اور پیچیدہ طلسم میں جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے ایک مبہوت حیوان کی سی زندگی بسر کرے اور فطرت کی ان کرشمہ سازیوں کا ایک خاموش اور غیر متعلق تماشائی بن کر رہے۔

مالتھس کا تصور سائنس کے جن نظریات پر مبنی ہے وہی اب بدل چکے ہیں۔ اب مادہ کا سکون آفریں تصور قابل قبول نہیں رہا۔ اس دنیا کو اب چند طبیعی قوتوں کا ایک کھیل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آگہی اور وقوف سے نوازے جانے کے بعد، انسان کی آزادی کی ابتدا ہوئی اور اس دور کا خاتمہ ہوا جب وہ مجبور محض تھا۔ اب انسان زمان و مکان کے تقیدات کا پابند نہیں بلکہ دور آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اس کے اشارۂ ابرو کے مطابق معین کرتا ہے، مادی اسباب وسائل کی کمی اس کے عزائم کو کمزور اور اس کے ارادوں کو پست نہیں کر سکتی بلکہ یہ اسے اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ فکر و شعور کی قوتوں سے مسلح ہو کر متصادم ہو، اور اسی طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرے۔

اس تصور کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ سوسائٹی پر محض ایک بوجھ ہے۔ آپ خود غور کریں جب انسان کو صرف ایک بوجھ کی حیثیت سے

دیکھا جائے تو اُس کے متعلق کس قسم کے جذبات پیدا ہوں گے اور کس قسم کے احساسات پرورش پائیں گے۔ جو لوگ انسان کے متعلق اس خیال کو پھیلا رہے ہیں وہ غالباً اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آدم کا جو بیٹا ایک پیٹ لے کر پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے دو ہاتھ دو پاؤں اور سوچنے سمجھنے کے لیے دل و دماغ کی بے شمار صلاحیتیں بھی لاتا ہے۔ اس نظریہ میں اس خیال کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ایک فرد جو کچھ سماج سے لیتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کچھ کہ وہ اُسے دنیا ہے یا دے سکتا ہے۔ بد دیانتی اور بے انصافی کی اس سے زیادہ اور کون سی مثال ہو سکتی ہے۔

ضبط ولادت کے نظریہ کو جن حالات نے جنم دیا انہیں بھی یہاں سمجھ لینا بے حد ضروری ہے۔ یورپ نے جب بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اُس سے کام لینا شروع کیا تو اس سے یورپ کا پورا نظام معیشت و معاشرت تہہ و بالا ہوا۔ چونکہ اس سارے ڈرامہ کا ہیرو سرمایہ تھا اس لیے اُسے سماج میں ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ وہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کا معبود بن گیا۔ پھر قوت و اقتدار دونوں خود بخود اُس کے قدموں میں آگرے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے ایسے ایسے نظریات گھڑے جن سے اُس کی پوزیشن بالکل مضبوط ہو جائے۔

یہی وہ وقت تھا جب محنت کشوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے جا رہے تھے۔ کارخانہ دار پیداوار کا اکثر حصہ خود سنبھال لیتا اور ان غریبوں کو قوت لایموت بھی میسر نہ آتی۔ وہ نہایت ہی حسرت بھری نگاہوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ قوم کے چند خوش نصیب لوگ دن بدن امیر سے امیر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں مگر اُن میں اب یہ سکت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ جسم و روح کے تعلقات کو قائم رکھ سکیں۔ اس نازک صورت حالات نے انہیں سوچنے پر مجبور کیا۔ سرمایہ داروں کو جب یہ خطرہ ہوا کہ کہیں اُن کے سوشلزم دوچار کی زد ہم پر نہ پڑے تو انھوں نے کمال عیاری سے لوگوں کے کان میں یہ بات پھونک دی کہ اس غربت و افلاس کی ذمہ داری یا تو خود اُن پر عائد ہوتی ہے یا فطرت پر۔ اور اس معاملہ میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ لوگ

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

(۲)

نکتۂ پنجم اب قرارداد کے اس حصے کی طرف آئیے جس میں کہا گیا ہے کہ اس لائحہ عمل کا چوتھا جزء (نظام حکومت کی اصلاح) بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے یہ جماعت کا بنیادی مقصد اور اس کے نصب العین کا لازمی تقاضا تھا، مگر اس کے لیے جماعت نے تقسیم ہند سے پہلے عملاً کوئی اقدام — اس نوعیت کا اقدام جیسا کہ تقسیم کے بعد کیا گیا — اس لیے نہیں کیا کہ اُس وقت مواقع اور ذرائع کا فقدان تھا اور بعض شرعی موانع ہمارے راستے میں حائل تھے۔

یہ ایک اہم نکتہ ہے جسے جماعت اسلامی کے تمام کارکنوں اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، کیونکہ اسے سمجھے بغیر ان کے لیے جماعت کی روح اور اس کی حقیقت اور اس کی تاریخ کو سمجھنا مشکل ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کے باعث آئندہ اپنے مقصود کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے قدم قدم پر انہیں ذہنی الجھنوں سے سابقہ پیش آئے۔ یہ اندیشہ اب خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ اس تحریک کے درمیانی مراحل میں آئے ہیں، یا آئندہ آئیں گے وہ اسے صرف اس کے لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کے سامنے وہ حالات نہ ہوں گے جن میں مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے یہ لٹریچر پیدا ہوتا رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی خاص دور کی لکھی ہوئی کسی عبارت سے کوئی شخص اُلٹے معنی برآمد کر بیٹھے اور الجھنوں میں مبتلا ہو جائے حالانکہ ایک تحریک کے لٹریچر کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے وہ حالات بھی آدمی کی نگاہ میں ہوں جن میں وہ لکھا گیا تھا۔ اس لیے میں طولِ کلام کی پروا کیے بغیر آپ کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بیان کروں گا کہ تقسیم ہند سے پہلے ہماری

تحریک کو کن حالات سے سابقہ تھا۔ اُن میں مواقع اور ذرائع کی کیا کمی تھی، اُن میں کس نوعیت کے شرعی موانع ہمارے راستے میں حائل تھے اور ان حالات میں ہم تحریک کے آغاز سے اگست ۱۹۴۷ء تک کس تدریج کے ساتھ کس راستے سے اپنے نصب العین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر آگے چل کر قرارداد کے چھٹے نکتے کی توضیح کرتے ہوئے میں یہ بھی بتاؤں گا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں فی الواقع حالات کے اندر کس نوعیت کا تغیر رونما ہوا، اور اُس تغیر کے ساتھ کیا نئے مواقع سامنے آئے، کیا نئے ذرائع بہم پہنچے، کیا امکانات شرعی موانع کو دور کرنے کے لیے پیدا ہوگئے اور اس صورت حال کا بروقت بالکل صحیح اندازہ کر کے ہم نے کیا راہ عمل اپنے لیے تجویز کی۔

جماعت اسلامی کی حقیقت اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کا ذہن اپنے اصل نصب العین کے معاملے میں اچھی طرح صاف ہو جائے۔ کسی شخص کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ نظام حکومت کی اصلاح اور انقلاب قیادت کی جدوجہد، یعنی "سیاست" کوئی عارضہ تھا جو جماعت اسلامی کو قیام پاکستان کے بعد کسی وقت یکایک لاحق ہو گیا۔ میں اپنی تقریر کی ابتدا میں اتنی تفصیل کے ساتھ جماعت کے نصب العین کی جو تشریح کر چکا ہوں اس سے یہ بات کسی اشتباہ کی گنجائش کے بغیر پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ زمام کار کی تبدیلی کو ہمارے نظام فکر و عمل میں آغازِ تحریک ہی سے بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں بلاخوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانۂ قریب کی تاریخ میں، کم ازکم برِعظیم ہند کی حد تک، جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیز کرتا ہے۔ اس جماعت نے محض اصلاحِ عقائد و اخلاق، محض اصلاحِ رسوم و عوائد، محض احیائے علوم دین، اور اسی طرح کے دوسرے اصلاحی و تعمیری کاموں پر اپنی فکر و عمل کو محدود و مرکوز نہیں کیا بلکہ ان سب کاموں کو ایک بڑے اور اصل مقصد کا ذریعہ قرار دیا۔ اور وہ یہ تھا کہ فاسد نظامِ زندگی کو اقتدار کے مقام سے ہٹا کر اس کی جگہ دینِ حق کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے غالب و فرمانروا بنایا جائے۔ یہ جماعت وجود ہی میں اس طرح آئی تھی کہ پوری بصیرت اور واضح دلائل و شواہد کے ساتھ یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر سامنے لا کر رکھ دی گئی تھی کہ:

— اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے جو دوسرے مذاہب کی طرح ہر نظام زندگی کے اندر رہ سکتا ہو بلکہ وہ ایک پورا نظام زندگی ہے جو تمام شعبہ ہائے حیات پر اپنا تسلط چاہتا ہے۔

— کسی غیر اسلامی نظام زندگی کے غلبہ و تسلط میں اسلام کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بچا کھچا اسلام موجود ہو وہ بھی زیادہ دیر تک بچا نہیں رہ سکتا، خواہ اسے محفوظ رکھنے کے لیے وعظ و تبلیغ اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذرائع سے کتنا ہی زور مار لیا جائے۔

— اصل خرابی کی جڑ کفر و فسق کی امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی ہے جس کی بدولت ایک خدا فراموش نظام زندگی قائم اور ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ بھی درحقیقت اسلامی نظام زندگی کے معتقد اور عملاً اس کے رواج کے طالب ہوں ان کی تمام کوششوں کا مقصود کفر و فسق کو امامت کے مقام سے ہٹا کر ایمان و عمل صالح کو اس مقام پر لانا ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے انہیں وہ تمام جائز و معقول تدابیر استعمال کرنی چاہئیں جن سے یہ اصلاحی انقلاب ممکن ہو۔

اس تخیل کو جن لوگوں نے قبول کیا تھا انہی سے جماعت اسلامی بنی تھی۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات کوئی نہ ہوگی کہ انہی لوگوں کے لیے اپنی تحریک کی اصل بنیاد مشتبہ ہو جائے اور وہ اسے بعد کے کسی دور کا عارضہ لاحقہ سمجھ بیٹھیں جسے لاحق رکھنے یا نہ رکھنے کا مسئلہ آج ان کے لیے بحث طلب ہو۔ اس کا بحث طلب ہو جانا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ ہمارے لیے جماعت اسلامی کو جماعت اسلامی رکھنا ہی بحث طلب ہو جائے، کیونکہ اس مقصود کے بغیر تبلیغ و اصلاح اور علمی تحقیقات کرنے والی جماعت، جماعت اسلامی تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔

تحریک اسلامی کے مراحل | اس ضروری تنبیہ و توضیح کے بعد میں آپ کے سامنے تاریخی ترتیب کے ساتھ یہ بیان کروں گا کہ آغاز تحریک سے تقسیم ملک تک مختلف ادوار میں اس مقصود کو سامنے رکھ کر کیا کام کس تدریج کے ساتھ کیا گیا۔ اور ہر دور کے کام کا واقعاتی پس منظر کیا تھا۔

پہلا دور | ابتدائے کار سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ وہ تھا جس میں ایک شخص کے محدود ذاتی ذرائع کے سوا کوئی ذریعہ کام کرنے کے لیے موجود نہ تھا، اور مواقع بھی اس سے زیادہ کچھ نہ تھے کہ سخت پراگندہ خیالی کے ماحول میں ایک نہایت قلیل تعداد ایسے لوگوں کی فراہم ہو سکتی تھی جو اسلام کے متعلق وہ باتیں پڑھنے اور

سننے کے لیے تیار ہوں جو وہ شخص پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس حالت میں کرنے کا کام یہی تھا، اور اس کے سوا کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ حکمت کے ساتھ مسلسل تبلیغ سے کچھ لوگوں کو اس تخیل کا اس حد تک معتقد بنا دیا جائے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس کے لیے عملاً کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس دور کے کام کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو خصوصیت کے ساتھ الجہاد فی الاسلام کا تیسرا باب (مصلحانہ جنگ)، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور تنقیحات کو بغور پڑھیں۔ ان میں سے پہلی کتاب میں وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ مسلمان دراصل نام ہی اُس بین الاقوامی گروہ کا ہے جسے دنیا میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے، اور یہ فریضہ حکومتِ باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ الٰہیہ قائم کیے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ دوسری کتاب میں اسلامی نظام زندگی کا جامع تصور اُس کی فکری بنیادوں اور منطقی تقاضوں کے ساتھ پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ہمہ گیر تہذیب ہے جو حیات دنیا کے تمام گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی اور تمام دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تیسری کتاب میں اول سے آخر تک جو بات ذہن نشین کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کافرانہ و فاسقانہ نظام زندگی کے ہمہ گیر فکری اور عملی تسلط کے تحت محض عقائد اور عبادات کے بل پر اسلامی نظام زندگی پنپ نہیں سکتا، بلکہ خود عقائد اور عبادات کا بھی اپنی جگہ قائم رہ جانا ممکن نہیں ہے۔ اس ہمہ گیر تسلط کو مٹا کر جب تک اسلام کا ہمہ گیر تسلط قائم کرنے کے لیے کام نہ کیا جائے گا کسی مذہبی حرکت و عمل سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا۔ یہ وہ بنیادی کام تھا جس سے بگاڑ کے اصل اسباب مشخص ہو کر نگاہوں کے سامنے آئے اور ذہنوں میں ایک ایسی تحریک کے لیے آمادگی پیدا ہوئی جس کا مقصد نظام زندگی میں اساسی تغیر پیدا کرنا ہو۔

دوسرا دور ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیانی زمانے میں ہندوستانی وطن پرستی کی تحریک کو وہ فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی جس سے یہ بات قریب قریب یقینی نظر آنے لگی کہ یہ تحریک بالآخر پورے ملک پر مسلط ہو جائے گی۔ اس دور میں سب سے بڑا خطرہ جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ یہ سیلاب کہیں ہندوستان کے مسلمانوں کو بہا نہ لے جائے اور اُس رہے سہے سرمائے کو بھی ختم نہ کر دے جو یہاں اسلامی نظام زندگی

کے احیاء کے لیے کام آسکتا تھا۔ یہ دور جن لوگوں نے پورے شعور کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ اُس وقت غیر منظم مسلمان کس بری طرح انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی سے مرعوب اور ہراساں ہوگئے تھے، اور ان کے منتشر اجزا کو اپنے اندر جذب کر لینے کے لیے ہندی وطن پرستی کی تحریک نے بظاہر "رابطہ عوام" اور بباطن "شدھی" کی جو تحریک اٹھائی تھی وہ اِس برعظیم میں اسلام کے مستقبل کے لیے کیسے سخت خطرات کی حامل تھی۔ ہماری تحریک کے نقطۂ نظر سے اُس وقت سب سے مقدم کام یہ تھا کہ اس سرزمین میں جو قوم اسلام سے اعتقادی، جذباتی اور تاریخی وابستگی رکھتی ہے، اور جسے اسلامی تہذیب کے احیاء و اعلاء کے لیے استعمال کرنا تمام دوسرے عناصر کی بہ نسبت سب سے زیادہ ممکن اور متوقع ہے، اسے وطنی قومیت میں گم ہونے سے روکا جائے اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کا جذبہ اس کے اندر ابھار دیا جائے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے پہلے دونوں حصے اور "مسئلہ قومیت" اسی دور کی پیداوار ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب میں ہندوستان کے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بدرجہا زیادہ شدید انقلاب طوفان کی سی تیزی کے ساتھ تمہارے سروں پر آرہا ہے اور اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کی مہلت ہے۔ پھر اس آنے والے انقلاب کی خصوصیات، اور مسلمانوں کی کمزوریوں کا تجزیہ کرکے صاف صاف بتایا گیا تھا کہ ان کمزوریوں کی موجودگی میں اس نوعیت کے انقلاب کی آمد اس سرزمین میں اسلام کے مستقبل پر کیا اثرات ڈال سکتی ہے اور اس کے بعد یہ اصولی حقیقتیں ان کے ذہن نشین کی گئی تھیں کہ: باطل کی جگہ باطل قائم کرنا مسلمان کا کام نہیں ہے اس لیے انگریزی قوم کی کافرانہ حکومت کو ہٹا کر "ہندوستانی قوم" کی کافرانہ حکومت لے آنا کوئی ایسا پاکیزہ مقصد نہیں ہو سکتا جس کے لیے لڑنا مسلمان کو زیب دیتا ہو۔ ایک کافرانہ نظام کے اندر محض وہ آئینی تحفظات، جن کا سبز باغ سیاسی لوگ تمہیں دکھاتے ہیں، اس سرزمین میں اسلامی تہذیب کے بقاء کے لیے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ہندی قوم پرستی کے سیلاب سے بچنے کے لیے انگریز کی گود میں پناہ لینا اور یہ چاہنا کہ اُس سے تمہیں بچانے کے لیے انگریز کا اقتدار یہاں موجود رہے، غلط بھی ہے اور

تمہارے لیے شرمناک بھی۔ تمہارے لیے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ خود اپنے اندر زندگی کی طاقت پیدا کرو اور اس طاقت کو صحیح سمت میں صحیح منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے استعمال کرو۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو چیز کم سے کم تمہاری مقصود بن سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک اگر کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔

دوسری کتاب میں اُس لادینی، جمہوری، قومی ریاست (SECULAR DEMOCRATIC NATIONAL STATE) کا، جسے انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان میں قائم کرنا چاہتی تھی، اور جسے مسلمانوں کے بہت سے نادان رہنما آزادیٔ وطن کا نام دے کر مسلمانوں کے لیے بھی آزادی کی تحریک سمجھ رہے تھے، پورا تجزیہ کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا ہر جز بجائے خود کیا معنی رکھتا ہے، اور خاص طور پر برعظیم ہند کے حالات میں ان اصولوں کا انطباق کیا اثرات پیدا کر سکتا ہے، اور عملاً کانگریس کی تحریک جو طریقے اختیار کر رہی ہے انہیں اگر چل جانے دیا جائے تو وہ کس طرح بالآخر اس سرزمین سے اسلام کے بچے کھچے آثار بھی مٹا کر چھوڑیں گے۔ اس ساری بحث کے بعد مسلمانوں کے سامنے پھر ایک نصب العین رکھا گیا جو پہلی کتاب کی بہ نسبت زیادہ واضح تھا مگر اس کتاب کے مقدمے ہی میں یہ اشارہ کر دیا گیا تھا کہ یہ بھی آخری مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود کی طرف صرف "ایک اور قدم" ہے۔

تیسری کتاب میں قومیت کے تصور سے بحث کی گئی تھی جس نے اُس دور میں خصوصیت کے ساتھ بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی پوری تحریک جس مقصد کے لیے کام کر رہی تھی وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دے کر لادینی اور جمہوریت کے اصولوں پر اُس کی ایک قومی ریاست بنائی جائے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے مذہبی رہنما تک اس کی بنیادی قباحت اور اس کے حقیقی نتائج کو نہیں سمجھ رہے تھے اور مسلمانوں کو اس مقصد کے لیے اس طرح کی قومیت میں جذب ہو جانے کا نہ صرف مشورہ دے رہے تھے، بلکہ یہ بھی ثابت کر رہے تھے کہ اسلام اس میں مانع نہیں ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف "قومیت" کے اِس جدید تصور کا

اور دوسری طرف اُن اصول و مقاصد کا جن پر اسلام نے امت مسلمہ کی اجتماعیت قائم کی ہے، پورا علمی جائزہ لے کر واضح کیا گیا کہ یہ دونوں چیزیں بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور مسلمان کبھی مسلمان رہتے ہوئے نہ مغربی طرز کے نیشنلزم کو اختیار کر سکتے ہیں، نہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنا کر لادینی جمہوری قومی ریاست بنا سکتے ہیں۔

یہ تینوں کتابیں جماعت اسلامی کی تحریک کے تاریخی ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ سے پہلی مرتبہ وقت کے اہم ترین سیاسی و اجتماعی مسائل میں براہ راست دخل دے کر واقعات کی رفتار کو اپنے نصب العین کی طرف موڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اگر اُس وقت بھی پہلے دور ہی کے طرز پر صرف علمی کام کے ذریعہ سے ذہن بنانے کی کوشش کی جاتی رہتی تو شاید آج تک بھی وہ وقت نہ آتا کہ جماعت اسلامی کے نظم میں اِس تخیل کے حامیوں کو منسلک کر کے اصل مقصود کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے کوئی منظم تحریک کھڑی ہو سکتی۔ لیکن چونکہ محدود ذاتی ذرائع ہی سے سہی، وقت کے بھڑکتے ہوئے مسائل میں دخل دیا گیا اور ان میں عوام کو ایک مدلّل اور معقول رہنمائی دینے کی کوشش کی گئی، اس لیے اس دعوت کو وسیع پیمانے پر لاکھوں آدمیوں تک پھیلا دینے اور ایک کثیر تعداد کو اس سے متاثر کر دینے کا موقع مل گیا، اور اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوا کہ آئندہ بننے والی جماعتِ اسلامی کے لیے کارکن فراہم ہونے کا بندوبست اسی وقت سے شروع ہو گیا، بلکہ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلم عوام کے اندر انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں جو زبردست تحریک اُس زمانے میں اٹھی وہ اِن کتابوں سے مدد لینے پر مجبور ہو گئی، اور اس کی رگ و پے میں وہ خیالات ابتدا ہی سے سرایت کر گئے جن کی وجہ سے آخر کار قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی قیادت کے لیے اس نئی ریاست کو لادینی جمہوری ریاست کے راستے پر ڈالنا مشکل ہو گیا۔

اس دور کے کام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تین کتابوں کے ساتھ خطبات کا بھی مطالعہ کیا جائے جو اسی دور کی چیز ہے۔ اُس کو، اور خصوصیت کے ساتھ اس کے آخری دونوں خطبوں کو، جو جہاد کے موضوع پر ہیں، اگر آپ غور سے پڑھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات کھل کر آجائے گی کہ اُس وقت

اگرچہ مسلمانوں کی قوتِ ہضم کو ملحوظ رکھتے ہوئے شبہ دار الاسلام اور ریاست اندر ریاست، اور تہذیبی خود اختیاری وغیرہ کے ناموں سے کچھ درمیانی نصب العین ایک ہلکی خوراک کے طور پر انہیں دیے گئے تھے، لیکن اصل مقصود کی طرف انہیں بتدریج دھکیلنے کی کوشش میں اُس وقت بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی تھی۔ "جہاد" کے ان دونوں خطبوں میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دی گئی تھی کہ نظامِ حکومت کی اصلاح کے بغیر نہ منکر کو مٹایا جا سکتا ہے نہ اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم چل سکتی ہے دین حقیقت میں غالب نظامِ زندگی ہی کا نام ہے۔ غالب نظام جو بھی ہو اس کے تحت مغلوب نظام نہیں چل سکتا۔ اسلام کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہی پورے نظامِ زندگی پر غالب ہو۔ اور ایمان کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ آدمی اس مقصد کے لیے اپنی جان لڑا دے۔

تیسرا دور اس کے بعد منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کا وہ دور شروع ہوا جو ۱۹۳۹ء سے تشکیلِ جماعت (اگست ۱۹۴۱ء) تک رہا ہے۔ یہ جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا نہایت اہم دور، اس کا زمانہ اسیس ہے جس میں پوری طرح کھول کر وہ راستہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا گیا جو اصل اسلامی نصب العین کی طرف جاتا ہے اور تمام دوسرے راستوں سے جن پر لوگ اس وقت دوڑ رہے تھے، اس کا فرق نمایاں کر کے رکھ دیا گیا۔ یہی چیز بالآخر اس کی موجب ہوئی کہ اس سخت ہنگامے کے دور میں ایک گروہ اِس راستے پر چلنے کے لیے تیار ہو گیا، اور اس امر کے امکانات پیدا ہو گئے کہ نظامِ زندگی میں اساسی تغیر کے لیے عملاً ایک منظم تحریک شروع ہو جائے۔

اس دور کے کام کو سمجھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ حالات آپ کی نگاہ میں ہوں جن میں یہ کام کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد ہندوستان میں ایک ایسا دور شروع ہوا تھا جس میں ایک طرف اس برِ عظیم کے مسلمان سخت انتشار، پراگندہ خیالی اور زیاں کاری میں مبتلا ہوتے چلے گئے؛ اور دوسری طرف گاندھی جی کی قیادت میں ہندو قوم پرستی روز بروز ایک زبردست طاقت بن کر اس قابل ہوتی چلی گئی کہ انگریزی اقتدار کی جانشین بن سکے۔ دونوں طاقتوں کا یہ فرق ہر سال بڑھتا چلا جا رہا تھا، یہاں تک کہ پندرہ برس بعد ۱۹۳۷ء میں اس کا یہ نتیجہ ایک [illegible]

کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی اور یہ بات علانیہ نظر آنے لگی کہ انگریزی اقتدار اس کے مقابلے میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکے گا۔ اس وقت مسلمان سوتے سوتے یکایک ہڑبڑا کر اٹھے اور ان میں ایک نئی قومی تحریک پیدا ہوئی جس نے دو تین سال کے اندر ان کے بہت بڑے حصے کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا۔ یہ تحریک گھبراہٹ میں شروع ہوئی تھی۔ فوری ہیجان کا نتیجہ تھی۔ کسی منظم فکر، کسی واضح مقصد، کسی سوچے سمجھے نقشے کی رہین منت نہ تھی۔ طرح طرح کے متضاد عناصر، متضاد رجحانات اور مقاصد کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ عام لوگوں کو جو چیز اس کی طرف کھینچ کر لا رہی تھی وہ اسلام سے ان کی محبت تھی جس کی بنا پر وہ اسلامی تہذیب کا احیاء، اور اسلامی حکومت کا قیام چاہتے تھے۔ لیکن دوسری طرف اس تحریک کی قیادت جس طرز پر کی جا رہی تھی وہ خالص قوم پرستانہ تھا جس میں مشکل ہی سے دینی رجحان کا کوئی شائبہ پایا جاتا تھا۔ ایسی تحریک کے نتیجے میں اس کے سوا کچھ ممکن نہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو (جس کا پرزور مطالبہ ۱۹۳۹ء میں شروع ہو چکا تھا) تو ایک ایسی لادینی جمہوری قومی ریاست قائم ہو جائے جس میں مسلمان عنصر غالب ہوں۔ یعنی وہی ہندوستان کا سا کافرانہ نظام صرف اس فرق کے ساتھ کہ ایک جگہ کوئی رام پرشاد اس کو چلائے تو دوسری جگہ کوئی عبداللہ اس کا منتظم ہو۔ ان دو رجحانات کے درمیان بہت سے جدید تعلیم یافتہ اور بہت سے دین دار لوگوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو یہ استدلال کر رہا تھا کہ اسلامی حکومت کے قیام کا راستہ یہی ہے کہ پہلے اس قوم پرستانہ تحریک کے ذریعہ سے مسلمانوں کی ایک قومی ریاست، چاہے وہ لادینی ہی کیوں نہ ہو، بن جائے، پھر اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس دلیل سے عام طور پر لوگ اطمینان کے ساتھ یہ سمجھ رہے تھے کہ واقعی اسلامی نصب العین کی طرف یہی راستہ جاتا ہے۔

اس کے ساتھ اس زمانے میں مسلمانوں کے اندر ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر ان لوگوں کا بھی موجود تھا جو کہتے تھے کہ ہم بھی اسلامی حکومت ہی کا قیام چاہتے ہیں، مگر اس کا راستہ یہ ہے کہ پہلے ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک میں شامل ہو کر انگریزی اقتدار سے آزادی حاصل کرو، پھر آزاد ہندوستان میں اس مقصد کے لیے جدوجہد شروع کرو۔ اس گروہ میں ملک کے نامور اور مقتدر علماء کی موجودگی لوگوں کے لیے سخت فریب کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔

ایک اور تحریک بھی اُس دور میں بڑے زور شور کے ساتھ چل رہی تھی جو اسلامی حکومت ہی کو مقصود قرار دیتی تھی، مگر اس تک پہنچنے کے لیے صرف فوجی تنظیم کو کافی سمجھتی تھی۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس کی بھی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔

ان حالات میں جو کام کیا گیا۔ (اور یاد رکھیے کہ یہ کام بھی صرف ایک شخص کے ذاتی ذرائع کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اور مواقع کا حال یہ تھا کہ وقت کی تمام تحریکوں سے اختلاف کرنے کے باعث یہ زمانہ اس کام کے لیے انتہائی ناسازگار تھا) اسے ہم تین بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں:

ایک کام یہ تھا کہ اسلامی حکومت کے بنیادی نظریے اور اس کے نمایاں خدوخال کو لوگوں کے سامنے کھول کر رکھا گیا تاکہ وہ اُس چیز کی نوعیت اچھی طرح سمجھ لیں جس کی صرف طلب ان کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ یہ کام اس زمانے کے متعدد مقالات اور تقریروں میں کیا گیا تھا، جن میں سے "جہاد فی سبیل اللہ" (مئی ۳۹ء) "اسلام کا نظریۂ سیاسی" (دسمبر ۳۹ء) اور "سلامتی کا راستہ" (اپریل ۴۰ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اوّل تو لوگ اپنی مطلوب شے کی صحیح نوعیت سمجھ کر اسے حاصل کرنے کے لیے وہ طریقہ اختیار کریں جو فی الواقع اس کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے، لیکن اگر یہ نہ بھی ہو سکے تو عام طور پر لوگوں میں اس کی واقفیت اس حد تک پیدا کر دی جائے کہ کوئی قیادت کل کسی وقت کوئی مذہبی کھلونا دے کر انہیں اس دھوکے میں نہ ڈال سکے کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ انہیں حاصل ہو گیا ہے۔

دوسرا کام یہ تھا کہ تہذیبِ اسلامی کے احیاء کی جو مبہم سی خواہش لوگوں میں اُس وقت اُبھر آئی تھی، اس کے متعلق انہیں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ یہ تہذیب دراصل ہے کیا چیز، اس میں اور دوسری تہذیبوں میں اصولی فرق کیا ہے، اور اس کا احیاء کس وسعت کے ساتھ، زندگی کے کن کن گوشوں میں، کس کس نوعیت کی مساعی چاہتا ہے۔ نیز یہ کہ ایک حقیقی اسلامی نظامِ حکومت کا قیام اس تہذیب کے احیاء اور نفاذ کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کے برعکس مسلمانوں کی جاہلی حکومت اس میں کتنی بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اس کام کے نشانات بھی اُس دور کے متعدد مضامین اور تقریروں میں آپ کو ملیں گے۔ مگر خاص طور پر "تجدید و احیائے دین" (فروری ۴۰ء) اور "اسلام اور جاہلیت" (فروری ۴۱ء) کا موضوع یہی تھا۔ اور اس سے

مقصود یہ تھا کہ سنجیدہ اور معاملہ فہم لوگ، جو خواہشات سے آگے بڑھ کر عملاً بھی کچھ کرنا چاہتے ہوں، یہ جان لیں کہ اگر واقعی یہی شے انہیں مطلوب ہے تو انہیں اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

تیسرا کام یہ تھا کہ مسلم قوم پرستی اور اسلام کا مخلوطہ جس کی بے شمار صورتوں نے اُس وقت ذہنوں میں سخت گھپلا ڈال رکھا تھا، اس کا پورا تجزیہ کر کے یہ حقیقت لوگوں کے سامنے بے نقاب کردی گئی کہ اسلامی نظام زندگی کا احیاء اور قیام فی الواقع کس نوعیت کی تحریک چاہتا ہے، اور جو تحریکیں مسلمانوں میں چل رہی ہیں وہ کیوں اِس نصب العین تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ یہ کام اُس سلسلۂ مضامین کے ذریعہ سے کیا گیا جو جولائی ۳۹ء سے ۴۱ء کے آغاز تک مسلسل لکھے گئے تھے اور فروری ۴۱ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے نام سے شائع ہوئے۔ اور یہی کام اُس تقریر میں بھی کیا گیا جو ستمبر ۴۰ء میں "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے عنوان پر علی گڑھ یونیورسٹی میں کی گئی تھی۔ اس کام کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس میں اُن دو بڑی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں مسلمان اُس وقت شدت کے ساتھ مبتلا تھے۔ کانگریسی وطن پرستی سے بغاوت کر کے وہ ایک نئی جدوجہد کا آغاز کر رہے تھے جس کا مقصد، کم از کم عام مسلمانوں کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ مگر پہلی غلط فہمی جس میں وہ پڑ گئے تھے وہ یہ تھی کہ ایک خالص قوم پرستانہ تحریک، جو مسلم قومیت سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کو لے کر اٹھے اور دینی رجحانات و محرکات کے بغیر محض نیشنلزم کے اصولوں پر چلے، وہ اسلامی حکومت کے قیام کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور دوسری غلط فہمی انہیں یہ لاحق تھی کہ پہلے مسلمانوں کی ایک لادینی جمہوری قومی ریاست بن جائے، پھر اسے اسلامی حکومت کے قیام کا ذریعہ بنا لیا جائے گا۔ اس کے جواب میں ان کو یہ بتایا گیا کہ اگر فی الواقع آپ کا مقصد ایک حقیقی اسلامی حکومت کا قیام ہے تو اس تک پہنچنے کا راستہ وہ نہیں ہے جو آپ اختیار کر رہے ہیں، بلکہ اس کے لیے ایک دوسری نوعیت کی تحریک درکار ہے جس کی یہ اور یہ خصوصیات ہوں۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی ایک بے دین قومی حکومت، اگرچہ وہ جمہوری ہی کیوں نہ ہو، اس مقصد کی راہ میں مددگار ہونے کے بجائے الٹی مزاحم بن جاتی ہے، اس لیے آپ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کریں، بلکہ اُس راہ سے اس کی طرف بڑھیں جو سیدھی اسی مقصود کی طرف جاتی ہے

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کا مضمون "اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"۔ ان دونوں مقالات کا موضوع دراصل یہی تھا، اور ان سے مقصود یہ تھا کہ آغاز ہی میں مسلمان جدوجہد کا صحیح رخ اختیار کریں۔

چوتھا دور لیکن جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے، وہ تحریک جو اس وقت قوم پرستی کے راستے پر چل پڑی تھی، اسی راستے پر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس میں جذب ہوگیا، اور اگست ۱۹۴۱ء میں جب اسلامی تحریک کے نقشے پر منظم جدوجہد کرنے کے لیے دعوتِ عام دی گئی تو ۳ کروڑ انسانوں کی آبادی میں سے صرف ۷۵ آدمی اس کے لیے جمع ہوئے۔

یہاں سے ہماری تحریک کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے، جب کہ وہ انفرادی سعی کے مراحل سے گزر کر اجتماعی سعی کے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس وقت سے ۱۹۴۷ء کے انقلاب تک ہم جن حالات میں اپنے نصب العین کے لیے کام کرتے رہے وہ مختصراً یہ تھے:

ذرائع کے لحاظ سے دیکھیے تو ہماری قوت ۷۵ افراد سے شروع ہوئی اور ۶ سال میں ۶۲۵ افراد تک پہنچی۔ اس کے ساتھ اگر عملی ہمدردوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو وہ ڈیڑھ دو ہزار سے زیادہ نہ تھے اور یہ تمام تر غریب یا نیم خوشحال متوسط طبقے کے لوگ تھے۔

مواقع کے لحاظ سے دیکھیے تو اس وقت ملک پر انگریزی حکومت قائم تھی جس کے ہٹنے کے آثار ۱۹۴۶ء تک دور دور بھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ملک میں دو زبردست تحریکیں انگریزی اقتدار کی جانشینی کے لیے کشمکش کررہی تھیں جنھوں نے پوری آبادی کی توجہ کو جذب کرلیا تھا۔ ملک کی تین چوتھائی آبادی اسلام کی نہ صرف منکر بلکہ اس کے خلاف سخت تعصب میں مبتلا تھی جس میں مسلمانوں سے قومی لڑائی کے باعث روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، اور اس پر مزید یہ کہ وہ اس وقت قوم پرستی کے نشے میں چور ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ ماحول اس کے سامنے اسلام کو ایک آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے انتہائی ناسازگار تھا۔ رہا ملک کی آبادی کا بقیہ ۱/۴ حصہ جو اسلام کا اقرار کرنے والا تھا، تو اس وقت اس پر مسلم قوم پرستی کی تحریک کا پورا غلبہ تھا اور وہ اپنی ساری پونجی ایک قومی ریاست کے قیام کی کوشش میں، اس اعتماد پر

لگا چکا تھا کہ اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کا کام بعد میں شروع کیا جائے گا۔
اس کے ساتھ شرعی موانع بھی ہمارے راستے میں حائل تھے، کیونکہ نظام حکومت خالص لادینی جمہوریت کے اصولوں پر قائم تھا جس میں انقلابِ قیادت بواسطۂ انتخاب کا دروازہ ہمارے لیے بند تھا۔ اور کسی مسلح انقلاب یا خفیہ تحریک کا راستہ بھی ہم نہ اختیار کر سکتے تھے، کیونکہ ایک جمہوری و آئینی نظام کی موجودگی میں ان طریقوں کے لیے کوئی شرعی جواز موجود نہ تھا۔
اِن حالات میں جس نقشے پر ہم کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ توسیعِ دعوت کے جتنے وسائل بھی بہم پہنچیں انہیں استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، پھر ان میں سے جو لوگ بھی عملاً اس مقصد کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہوں انہیں جمع کر کے اور تربیت دے کر ایک ایسا صالح گروہ منظم کر لیا جائے جو ایک متبادل قیادت کا بار اٹھانے کے لائق ہو سکے، اور آگے اس امر کا انتظار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کے لیے مزید مواقع بہم پہنچائے۔ اس دور میں سب سے زیادہ جو سوال سوچنے سمجھنے والے طبقے کو پریشان کرتا تھا وہ یہ تھا کہ آخر ایک ایسے ملک میں جہاں ایک منظم غیر اسلامی ریاست — اور وہ بھی زمانۂ جدید کی ریاست جس سے بڑھ کر زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی اور مسلط ہونے والی ریاستیں کسی سابق دور میں نہ پائی جاتی تھیں — موجود ہے، اور غالب آبادی غیر مسلم ہے، وہ انقلاب عملاً کیسے رونما ہوگا جو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں؟ فرض کیجئے کہ ہم غالب حصۂ آبادی کے خیالات، ذہنیتیں، اخلاقی معیارات، سب کچھ بدل دینے میں کامیاب ہو جائیں، تب بھی کفر کا اقتدار آپ سے آپ تو ختم نہیں ہو جائے گا۔ اسے بدلنے کے لیے بہرحال کوئی عملی صورت ہی اختیار کرنی ہوگی۔ اب اگر ہم انتخابات کے ذریعہ سے انقلابِ قیادت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے، کیونکہ لادینی ریاست کے اندر انتخابات میں حصہ لینا ہمارے عقیدے کے خلاف ہے، تو کیا ہم مسلح انقلاب کریں گے؟ یا کہیں ہجرت کر کے مدینۂ طیبہ کے طرز کی کوئی ریاست قائم کریں گے اور پھر جہاد کر کے اس ملک کو دارالاسلام بنائیں گے؟ یا پھر کیا پیروانِ مسیح کی طرح ہم دو تین سو برس تک اس انتظار میں تبلیغ و اشاعت اور تحمل مصائب و شدائد کا طویل دور گزاریں گے کہ کوئی قسطنطین مسلمان ہو کر خود ہی یہاں اسلامی حکومت قائم کر دے؟ یہ سوالات

اُس زمانے میں میرے سامنے بار بار پیش کئے جاتے تھے۔ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں میں نے ترجمان القرآن میں ایک دفعہ لکھا تھا:

"اصولی طریق کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت قبول کریں منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے، یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلے پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاق، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقے (METHOD) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (SUBSTANCE OF POWER) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔"[1]

اس سلسلے میں ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے اُسی زمانے میں لکھا گیا تھا:

"الکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (SECULAR) جمہوری (DEMOCRATIC) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ طریق کار ہم صرف اُس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ،

اولاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اُس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

---

[1] رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۵۰۔ دراصل یہ مضمون ستمبر و اکتوبر ۴۵ء کے ترجمان میں شائع ہوا تھا۔

ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔[1]

اس کے ساتھ ایک اور ضروری اقتباس جو ہماری اُس دور کی پالیسی کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتا ہے ۱۹۴۳ء کی اُس تقریر میں ملاحظہ فرمائیے جو اجتماع دربھنگہ میں کی گئی تھی۔ اس میں عرض کیا گیا تھا:

"ہمیں عوام میں ایک عمومی تحریک (MASS MOVEMENT) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور اس اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دُہرے فرائض کو سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لیا جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی۔ یہ کام چونکہ ٹھنڈے دل سے کرنے کا ہے اور ایک عمومی تحریک کی طرح فوری ہلچل اس میں نظر نہیں آ سکتی ہے، اس وجہ سے نہ صرف ہمارے ہمدرد و ہم خیال لوگ، بلکہ خود ہمارے ارکان تک بددل ہونے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ارکانِ جماعت کام کے اس نقشے کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی قوتیں بددلی کی نذر کرنے کے بجائے کسی مفید کام میں استعمال کریں۔ یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدت مدید درکار ہے مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح ہو چکنے کے انتظار میں ملتوی نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے پیش نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔ مگر صرف مرجعیت

---

[1] رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۶۳ تا ۲۶۴ ۔ یہ مضمون دسمبر ۱۹۵۱ء کے ترجمان میں شائع ہوا تھا۔

سے بھی کام نہیں چلتا۔ اُس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہوکر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔ ایک ٹھوس، پائدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلے کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ تحریک کی تباہی ناگزیر ہے۔ اگر موجودہ حالات میں عوام کو اکسا دیا جائے جب کہ اُن کو سنبھال کر لے چلنے والے مقامی رہنما (SUB LEADERS) نہیں ہیں، تو عوام بالکل بے راہ روی پر اتر آئیں گے اور اپنے آپ کو نااہل لوگوں کے حوالے کردیں گے[1]۔"

اس ساری بحث سے آپ یہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اقامت دین کے نصب العین کے ساتھ زمام کار کی تبدیلی اور انقلاب امامت و قیادت تو بالکل لازم و ملزوم کی طرح آغاز ہی سے اس تحریک کے بنیادی تخیل میں شامل تھی، اور اس کے لیے ہر زمانے میں ذرائع اور مواقع اور حالات کے لحاظ سے مسلسل جدوجہد بھی کی جاتی رہی، البتہ اُس نوعیت کا اقدام، جیسا کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں شروع کیا گیا، اُس وقت عملاً ممکن نہ تھا، کیونکہ اس کے لیے نہ ہمارے پاس ذرائع تھے، نہ وقت کے حالات میں اس کا کوئی موقع ہمیں مل رہا تھا، اور نہ شرعی موانع کے باعث ہم ایسا کر ہی سکتے تھے۔

ایک غلط فہمی کی اصلاح آج بعض لوگ حالات کے سیاق و سباق کو نظر انداز کرکے "سیاسی کشمکش" حصہ سوم اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے بعض اقتباسات پیش کرکے ان سے چند بالکل غلط نتائج نکال رہے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قبل تقسیم کے حالات کی بحث کے سلسلے ہی میں اُس اصل غلط فہمی کو، جس میں وہ مبتلا ہیں، صاف کردوں تاکہ آگے کی بحثوں میں یہ ذہنی الجھن بار بار تنگ نہ کرے۔ یہ دونوں مضامین جن کا وہ حوالہ دیتے ہیں، سنہ ۱۹۴۰ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ اُس وقت بحث یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کی لادینی قومی جمہوری ریاست تو وجود میں آگئی ہے، اب اسے اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کیسے کیا جائے، بلکہ یہ بحث تھی کہ ہم دارالکفر میں رہتے ہوئے ایک اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کس طرح کریں۔ اس کے لیے ایک گروہ یہ راستہ تجویز کر رہا تھا کہ پہلے ایک قوم پرستانہ تحریک کے ذریعہ سے قوم پرستی

[1] روداد جماعت حصہ اول، ص ۵۸، ۵۹

کے معروف اور چلتے ہوئے طریقوں پر کام کر کے مسلمانوں کی ایک لادینی ہی سہی، قومی و جمہوری ریاست قائم کر دینی چاہیے پھر اسے ہم اسلامی نظام حکومت کے قیام کا ذریعہ بنائیں گے اور جمہوری انتخابات کے واسطے سے اس کو اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کر لیں گے۔ میرا استدلال اس کے جواب میں یہ تھا کہ:

(۱) یہ پھیر کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے آپ آغاز ہی میں براہِ راست اسلامی حکومت قائم کرنے کا وہ راستہ کیوں نہ اختیار کریں جو اس مقصد تک پہنچنے کا فطری راستہ ہے۔

(۲) یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی قومی حکومت کا قیام اسلامی نظام حکومت کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے، یا اس کا مفید ذریعہ بن سکتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ چیز الٹی مانع و مزاحم ہوتی ہے، اور بسا اوقات کافروں کی حکومت سے زیادہ کامیاب مزاحمت کرتی ہے۔

(۳) یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس وقت انتخابات کے ذریعہ سے نظام حکومت کو تبدیل کرنا نسبتاً کوئی آسان کام ہوگا۔ دراصل اس وقت بھی اصلاح کے لیے وہی سارے پاپڑ بیلنے پڑیں گے جو آج (یعنی ۱۹۳۸ء میں) براہِ راست اسلامی نظام حکومت کے قیام کی کوشش میں بیلنے ہوں گے، اور اس وقت بھی اس راہ میں ویسی ہی مزاحمتیں ایک بگڑا ہوا مسلمان برسرِ اقتدار طبقہ کرے گا جیسی آج کفار کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر یہ سب کچھ اس وقت بھی پیش آنا ہے تو ہم آج ہی سے وہ اصل کام کیوں نہ شروع کر دیں جس سے دراصل اسلامی حکومت قائم ہوا کرتی ہے، اور اس درمیانی چیز کے قیام میں اپنی قوتیں کیوں صرف کریں جب کہ اسے مددگار نہیں بلکہ مزاحم ہی بننا ہے۔

ان تینوں نکات کو نگاہ میں رکھ کر آپ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"، اور "اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں" کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کے سامنے وہ اصل مسئلہ واضح ہو جائے گا جو اس وقت زیرِ بحث تھا، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت میرا موقف کیا تھا۔[1] اب یہ بات آپ

---

[1] خصوصیت کے ساتھ مقدم الذکر مضمون کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے:

"حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو

(اگلے صفحہ پر سلسلہ جاری ہے)

میں سے آخر کس سے چھپی ہوئی ہے کہ سنہ ۴۰ء سے سنہ ۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے واقعات کی دنیا کس قدر بدل گئی؟ سنہ ۴۰ء میں جو راستہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے میں نے پیش کیا تھا، مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس کو

کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا ...... میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اور اگر وہ اُس بے لاگ عدل اور اُن بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ یہ قومی حکومت، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اُس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس قسم کی قومی حکومت کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟"

اسی بات کو موخر الذکر مضمون میں یوں بیان کیا گیا تھا:

"اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے، اور ان کے نفسیات

اختیار نہ کیا۔ وہ اسی "درمیانی چیز" کے لیے کوشاں رہے جسے میں نے بیچ کا راستہ کہا تھا۔ حتیٰ کہ بالآخر وہ لادینی جمہوری قومی ریاست پاکستان میں قائم ہوگئی، جس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ وہ اسلامی نظام حکومت کے قیام میں مددگار ہونے کے بجائے سخت مزاحم ہوگی اور اسے جمہوری طریقوں سے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ یہ سب کچھ پیش آجانے کے بعد اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ اس کے پیش آنے سے پہلے جن خطرات کا میں نے ذکر کیا تھا، اب مجھے ان کو دفع کرنے کے بجائے انہیں صحیح کر دکھانے کی کوشش کرنی چاہیے، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی معاملہ فہمی کی داد دوں یا سخن فہمی کی۔ بے شک میں نے کہا تھا کہ جاہلیت کے اصول پر مسلمانوں کی قومی ریاست بن جانا اسلامی حکومت کے

میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت الٰہیہ کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربے کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے الٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہوگیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورت معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟"

قیام کا ذریعہ نہیں ہے اس لیے اس درمیانی چیز کے لیے کوشش کرنے کے بجائے اصل مقصد کے لیے براہ راست کوشش کرو۔ مگر کیا اس کا یہ مطلب تھا، یا اب لینا درست ہے، کہ وہ درمیانی چیز جب قائم ہو جائے تو ہمیں اس کو اسلام کی راہ میں اتنا ہی اور ویسا ہی سخت مزاحم بن جانے دینا چاہیے جس کا خدشہ ہم نے ظاہر کیا تھا، اور اسے اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے؟ بے شک میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کی قومی جمہوری ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنا سخت مشکل کام ہوگا، کیونکہ عام رائے دہندوں کو گمراہ کرکے نہایت بدکردار لوگ برسر اقتدار آجائیں گے اور وہ کفار سے بھی زیادہ جسارت کے ساتھ اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ مگر کیا اس سے یہ استدلال کرنا درست ہے کہ جب اس طرح کی ریاست وجود میں آجائے تو ہمیں بدکرداروں ہی کے ہاتھ میں اسے چھوڑ دینا چاہیے اور جمہوری طریقوں سے اس کی قیادت تبدیل کرنے کی کوشش کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے؟ بے شک میں نے ۱۹۴۰ء میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک طریق کار پیش کیا تھا۔ مگر کیا یہ کوئی عقلمندی ہوتی کہ ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے حالات میں جو عظیم تغیر رونما ہو گیا تھا اس کا ہم کوئی نوٹس نہ لیتے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھ کر اپنے ابتدائی طریق کار میں کوئی ردوبدل نہ کرتے؟ بے شک میں نے اُس طریق کار کو انبیاء کا طریقہ کہا تھا، اور آج بھی کہتا ہوں، مگر کسی صاحب عقل آدمی سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ایک طریق کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر اُن کے انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق نہ کرے گا۔ اس طریق کار کے بنیادی اصول ہم نے کبھی نہیں بدلے، نہ انہیں بدلنے کے ہم قائل ہیں۔ لیکن جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عملدرآمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اُس عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کرکے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کا دور درحقیقت میں تو اسے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل سمجھتا ہوں کہ جونہی ۱۹۴۷ء میں یکایک ہم ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوئے، اُس نے عین وقت پر ہماری رہنمائی فرمائی اور ہمیں اس قابل کر دیا کہ حالات کا صحیح اندازہ کرکے، اور جس رخ پر وہ جا رہے تھے انہیں ٹھیک ٹھیک

سمجھ کر اپنی تحریک کے لیے ایک نئی پالیسی بنا سکیں۔ تقسیم ملک کی اسکیم سامنے آتے ہی اُس کے نتائج بالکل اس طرح ہمارے سامنے آ گئے جیسے ریاضی کے کسی سوال کا جواب ہوتا ہے۔ ہم نے فوراً یہ سمجھ لیا کہ اب ہندوستان اور پاکستان میں ایک طریق کار کسی طرح نہیں چل سکتا۔ ہمیں یہ سمجھنے میں بھی ایک لمحہ کی دیر نہ لگی کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو اُس سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے جن کا اندیشہ ۳۷ء اور ۳۸ء میں سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم میں ظاہر کیا گیا تھا، اور پاکستان میں وہ صورت حال پوری شدت کے ساتھ سامنے آنے والی ہے جس کی طرف ۳۹ء اور ۴۰ء میں سیاسی کشمکش حصہ سوم میں کھلے کھلے اشارات کیے جا چکے تھے۔ ہم کو خدا کے فضل سے یہ رائے قائم کرنے میں بھی کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ ان دونوں ملکوں میں اس تحریک کے طریق کار کو کس طرح نئے حالات کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ایک طرف روداد جماعت حصہ پنجم میں امیر جماعت کی وہ تقریر بغور پڑھیں جو اپریل ۴۷ء کے اجتماع مدراس میں کی گئی تھی[1]، اور دوسری طرف مئی ۴۷ء کے اجتماع دارالاسلام کی وہ تقریر ملاحظہ فرمائیں جو "جماعت اسلامی کی دعوت" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ پہلی تقریر میں پوری وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مستقبل کیا ہے[2]۔ اور اس کے مقابلے میں ہندو اکثریت کس مستقبل سے دوچار ہونے والی ہے[3]، اور ان حالات میں اسلام کے لیے کام کرنے کی راہ کیسے کھلے گی[4]۔ دوسری تقریر اس کے برعکس بالکل ہی ایک دوسرے انداز کی ہے جس کے موضوع اور مضمون کو پہلی تقریر سے بجز مقصد کی یگانگت کے اور کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے جس حصے میں مسلم اکثریت حکمراں ہونے والی ہے اُس میں ہم کن اصولوں پر ایک نیا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ دونوں تقریروں کا متقابل مطالعہ آپ پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دے گا کہ ایک تحریک جو برسوں تک ایک مقصد کے لیے ایک طریق کار پر چلتی رہی تھی اُس کے لیے دو نئے ملک بنتے ہی آئندہ پیش آنے والے حالات کا بروقت اندازہ کر کے کس طرح دونوں ملکوں میں کام کے دو مختلف پروگرام تجویز کیے گئے، حالانکہ مقصد وہی ایک رہا یعنی نظام جاہلیت کو ہٹا کر اسلامی نظام زندگی کو غالب کرنا، اور طریق کار کے بنیادی اصول بھی جوں کے توں رہے یعنی دعوت، تنظیم اور توسیع نفوذ کے ذریعہ سے جاہلی قیادت کے مقابلے میں ایک اسلامی قیادت کو ابھارنا، اور پھر جو ذرائع و مواقع بھی ہم پہنچیں انہیں استعمال کر کے حصول مقصد کی جدوجہد کرنا۔

[1] روداد جماعت حصہ پنجم صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹۔ [2] روداد جماعت حصہ پنجم صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۷۔ [3] روداد جماعت حصہ پنجم صفحات ۱۲۰ تا ۱۲۳ و ۱۲۷ تا ۱۲۸۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے دور سے گذرتے ہوئے

نعیم صدیقی

(گذشتہ سے پیوستہ)

حضرت عائشہ کی آپ بیتی: اس طوفانِ عظیم میں حضرت عائشہ کے سفینۂ قلب و روح پر جو کچھ گذری اس کی مستند تفصیل خود آنجناب اور دوسرے رواۃ کی زبانی حدیث، سیرت اور تاریخ کی اہم کتابوں میں محفوظ ہے میرے سامنے اس وقت زاد المعاد (ملاحظہ ہو: ج ۲ صفحہ ۱۱۳-۱۱۵) اور سیرت ابن ہشام (ملاحظہ ہو ج ۳ صفحہ ۳۰۲-۳۱۴) جیسے مستند مآخذ ہیں لیکن چونکہ صاحب تفہیم القرآن نے حضرت عائشہ کی روداد الم کا بہترین الفاظ میں ترجمہ کر دیا ہے۔ لہٰذا اسی کو مستعار لیتا ہوں[۱]:-

مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہ تھا، البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف تیکم (کیسی ہیں یہ؟) اس سے زائد کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔ ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی اس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلاء نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ

---

[۱] ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۴۵ عدد ۲ صفحہ ۱۷-۱۹

مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی ان لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے) راستے میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: غارت ہو مسطح۔ میں نے کہا: عجیب ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا: بیٹیا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟ پھر انھوں نے سارا قصہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مسطح، حسان بن ثابت مشہور شاعرِ اسلام، اور حمنہ بنت جحش، حضرت زینب کی بہن کا حصہ سب سے نمایاں تھا) یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی۔ سیدھی گھر گئی اور رات رو رو کر کاٹی۔ (اس موقع پر ابن ہشام کی نقل ہوئی روایت میں یہ الفاظ بڑے اہم ہیں کہ رونے کا عالم یہ رہا کہ "مجھے اندیشہ ہوا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔" (ن ص)

حضرت عائشہ اس کرب میں جان گھلا رہی تھیں لیکن شہر بھر میں چہ میگوئیوں کا ایک چکر چل رہا تھا۔ ان کی طرف سے سب سے بڑھ کر صفائی دے سکنے والے ان کے والد اور شوہر ہی ہو سکتے تھے جو ان کے ذہن، کردار کا قریبی اور نفسی علم و تجربہ رکھتے تھے۔ مگر اس طرح کے بہتان جب ظالم لوگ لگا دیتے ہیں تو جو جتنا قریبی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پیچیدگی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی صفائی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ والد اور شوہر دونوں دم بخود تھے اور چار جانب سے زبانوں کے چھوڑے ہوئے تیر کھا رہے تھے۔

انسانیت کے محسنِ اعظم پر یہ گھڑیاں جس درجہ شاق گزری ہوں گی — ذاتی لحاظ سے بھی، اور تحریک کے مفاد کے لحاظ سے بھی — ان کا کچھ تھوڑا اندازہ ہر شریف اور حساس اور ذمہ دار آدمی کر سکتا ہے۔ صبر و سکوت سے بہت کام لیا، لیکن اس نازک معاملہ کو موجودہ حالت میں معلق تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اِدھر یا اُدھر کوئی ایک فیصلہ ناگزیر تھا۔ سو حضورؐ نے غیر جانبدارانہ طریق سے تحقیق شروع کی۔ اپنے دو قریبی رفقا حضرت علیؓ اور حضرت اسامہ بن زید کو طلب فرمایا اور ان سے رائے طلب کی۔ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ!

وہ آپ کی زوجۂ محترمہ ہیں اور ہم ان کے بارے میں بجز خیر کے کچھ نہیں پاتے، یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے۔ جیسے پھیلایا جا رہا ہے[۱] حضرت علیؓ نے بالکل دوسرے ہی پہلو سے مسئلے کو لیا اور فرمایا: "یا رسول اللہ عورتوں کی کمی نہیں، آپ اس کے بجائے دوسری بیوی کر سکتے ہیں۔ یوں آپ لونڈی کو بلا کر تحقیق فرمالیں[۲]" اصل میں حضرت علیؓ کا منشا یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ حضورؐ پریشان رہیں، کیوں نہ ایسی بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر لیں جس کے بارے میں ایک طوفان اٹھا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خاص رشتے کی وجہ سے اس معاملے کے تحریکی پہلو کی بہ نسبت حضورؐ کی ذاتی پریشانی کو زیادہ اہمیت دی اور وہ رائے دی جس سے آپ اس ذہنی الجھن سے نکل کر مطمئن ہو جائیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مشورہ کا دوسرا جز سرورِ عالم نے قبول فرمایا اور اس کے مطابق گھر کی خادمہ کو طلب کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے چھوٹتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا اور مار کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ سچ کہہ دو۔ اس نے کہا: "خدا کی قسم میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی اور میں اس کے علاوہ اور کوئی نقص عائشہؓ میں نہیں نکال سکتی کہ میں آٹا گوندھتی تھی اور کہہ کر جاتی کہ ذرا اسے دیکھتی رہنا، اور وہ پڑی پڑی سو جاتیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی[۳]"۔ اس بے ساختہ بیان میں خادمہ نے جتنی مکمل صفائی حضرت عائشہ کی دے دی تھی اس پر کوئی دوسرا بیان مشکل ہی سے اضافہ کر سکتا ہے۔ اس نے ایک ایسی بھولی بھالی اور سادہ منش لڑکی کا حقیقی نقشہ پیش کر دیا جس کے نقشے میں کسی شر کو انسانی عقل نصب نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اقدام تحریکِ اسلامی کے سربراہ کارِ اعلیٰ نے یہ کیا کہ مجلسِ عام میں خطاب فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد بڑے درد بھرے الفاظ زبان سے نکلے:

"آخر ان لوگوں کا مدعا کیا ہے جو مجھے میرے اہلِ خانہ کے بارے میں دکھ دیتے ہیں اور ان کے متعلق خلافِ واقعہ باتیں کہتے پھرتے ہیں۔ خدا کی قسم، ان کے بارے میں بجز بھلائی کے کوئی اور بات میرے علم میں نہیں ہے اور وہ یہ بات ایک ایسے شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی بھلائی کے سوا میرے علم میں کوئی اور بات نہیں ہے۔ اور اس نے میرے کسی گھر میں بھی میری موجودگی کے بغیر کبھی قدم نہیں رکھا۔"

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۳ صفحہ ۳۲۴ ۲؎ ایضاً۔ ۳؎ ایضاً ۴؎ سیرت ابن ہشام کی روایت کے موجب واقعہ کا یہ حصہ ترتیب واقعات کے لحاظ سے مقدم تھا۔ ملاحظہ ہو ج ۳ صفحہ ۳۲۲ ۵؎ سیرت ابن ہشام ج ۳ صفحہ ۳۲۵۔

دوسری روایت میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں :

"کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جو میرے گھروالوں کے بارے میں مجھے ایذا دیتا ہے[1]"

یہ سن کر قبیلہ اوس کے سردار اُسید بن حضیر نے اٹھ کر عرض کیا : "یا رسول اللہ ! اگر ایسے لوگ ہمارے قبیلے کے ہوں تو ہم ان سے نمٹ لیں گے اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہوں تو آپ حکم دیں، خدا کی قسم ! ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔" دوسری طرف سے خزرجیوں کے سردار سعد بن عُبادہ بھنّا کر اُٹھے اور کہا " جھوٹ کہتے ہو، بخدا ہم ان کی گردنیں نہیں ماریں گے۔ ہاں ہاں ! خدا کی قسم ، تم نے یہ بات اسی بنا پر کہی ہے کہ ان کا تعلق خزرج سے ہے" حضرت سعد کا یہ خلافِ توقع جواب اُسید بن حضیر کو سخت ناگوار گزرا۔ انھوں نے غالباً یہ محسوس کیا ہو گا کہ جس جماعت میں مجرموں اور فسادیوں اور شر پسندوں کو پناہ اور سرپرستی کسی نمایاں شخصیت کی طرف سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اجتماعی ماحول کی تطہیر آسان نہیں رہتی۔ عبداللہ بن ابی ہمیشہ تحریکوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ایک مضبوط اور خود شناس نظامِ جماعت کا معدہ ایسی مکھیوں کو جزوِ بدن نہیں بننے دیتا بلکہ اُگل کر پھینک دیتا ہے۔ البتہ اگر کسی شرپسند کو کسی نظامِ جماعت کے اندر ممتاز اور مضبوط افراد اپنے پروں کے نیچے لینے والے مل جائیں تو پھر مارہائے آستین پرورش پاتے رہتے ہیں اور جماعتوں کو ان کے ڈنک کھانے پڑتے ہیں۔ اسی تلخ حقیقت کے احساس کی بنا پر حضرت اُسید شدتِ جذبات میں بول اُٹھے : "غلط تم کہتے ہو، بخدا ! بلکہ تم خود منافق ہو، جبھی منافقوں کی وکالت و حمایت کرتے ہو[2]"

یہ ناخوشگوار صورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اوس و خزرج کے درمیان کھچاؤ پیدا کرنے کے لیے بھی تو متواتر فتنہ کی بارود بچھائی جا رہی تھی۔ جبھی ذرا سی بات پر جذباتی ہیجان پیدا ہو گیا اور جماعت کے دوگونہ عناصر متحرک ہو گئے۔ کچھ ادھر سے اُٹھے ، کچھ اُدھر سے ، اور قریب تھا کہ اوس و خزرج باہم دگر گتھ جائیں۔ دونوں قبیلوں کو شیر و شکر کرنے والے قائدِ جلیل کو یہ گوارا نہ تھا کہ برسوں کی محنت سے بندھا ہوا یہ شیرازہ اس کی ذات کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے ، اور خود تحریک ہی کی چولیں ہل جائیں۔ آپؐ منبر سے اُتر آئے ، لوگوں کو ٹھنڈا کیا

---

[1] زاد المعاد ج ۲ صد ۱۱۴ ۔ [2] سیرت ابن ہشام ۔ ج ۳ ص ۳۴۵

اور مجلس برخاست کردی۔

حضورؐ کے لیے جماعت کے اس کمزور پہلو کا یہ نیا تجربہ پہلی پریشانی میں کتنے اضافہ کا موجب بن گیا ہوگا۔ یہ دراصل عصبیت کی وہی بارود پھٹ رہی تھی جسے عبداللہ بن ابی غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر دلوں کی گہرائیوں میں بچھا چکا تھا۔

کہانی کا آخری حصہ بھی، جس نے حزینہ کو طربیہ بنا دیا، خود اس کہانی کے مرکزی کردار (حضرت عائشہؓ) کی زبانی ہی سنیے :۔

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخرکار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور امّ رومان (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آکر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا! عائشہ مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے (بے گناہ آدمی سے اسی فطری کیفیت کی توقع کرنی چاہیے۔ ن م) میں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ رسول اللہ کی بات کا جواب دیں انہوں نے فرمایا، بیٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ ہی کچھ کہیں انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی، آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے، اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں ــــ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں ــــ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کر لوں جو میں نے نہیں کی ــــ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی ــــ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ

لہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۵

کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا۔ (ایک بے گناہ جب کسی بھاری الزام کی زد پہ آکر لانحل اضطراب میں پڑتا ہے تو اس کے عالم نفسیات میں ایسے ہی حوادث صادر ہوتے ہیں۔ ن۔ص) آخر میں نے کہا، اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فصبرٌ جمیل (اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جب کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ان کے بیٹے بن یمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا) یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ (بے بسی اور اس کے ساتھ یہ عالم بے نیازی پھر اسی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جب کہ کسی بے گناہ پر کوئی الزام چپیکا گیا ہو۔ ن۔ص)

اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالےٰ میری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہؓ! اللہ نے تمہاری برأت نازل فرمادی اور اس کے بعد حضور نے دس آیتیں سنائیں۔ میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا، میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی، نہ آپ دونوں کا! بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔[1] (ذرا یہ شکوہ بھرا غیورانہ انداز گفتگو ملاحظہ ہو، کیا یہ کسی مجرم ضمیر کی ترجمانی کرتا ہے؟ ن۔ص)

اس آپ بیتی کا حرف حرف بول کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بے گناہ کی داستانِ درد ہے جو ہر تصنع سے پاک ہے اور جس میں حقیقی کرب کا بے ساختہ اظہار ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن۔ ماخوذ از ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۴۵ عدد ۵ صفحہ ۹

تبصرہ، تجزیہ اور ترکیب | پروپیگنڈہ کے اس طوفان اور اس کے پیدا کردہ بُحران (CRISIS) کی اتھاہ تاریکیوں کا توڑ کرنے کے لیے یکایک افقِ وحی چمک اٹھا۔ معاشرے کے ذہنی عالم میں صبحِ الہام نمودار ہوئی اور آیاتِ بینات کی کرنیں روحانی فضاؤں میں رقص کرنے لگیں۔ کیا ہی خوب مناسبت تھی کہ جو سورۃ اس بُحران کا ازالہ کرنے اُتری، اس کا نام سورۃ نور قرار پایا۔ اس سورۃ میں جماعت اور معاشرہ پر تبصرہ کیا گیا، اس کی کمزوریاں واضح کی گئیں اور ان کمزوریوں سے اسے مستقل طور پر پاک کر دینے کے لیے قانونی اور اخلاقی ہدایات دی گئیں۔

اس معرکہ آرا سورۃ کے مضمون کی اٹھان ہی چونکا دینے والی ہے۔ فرمایا گیا۔۔۔

" یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور جسے ہم نے ذمہ داری کے طور پر ۔۔۔۔
(اسلامی معاشرے کے لیے) لازم ٹھہرایا ہے اور جس میں ہم نے نہایت واضح باتیں پیش کر دی ہیں شاید کہ تم لوگ ان سے استفادہ کرو!" (آیت ۱)

اب سورۂ نور کی صدا معاشرے میں گونجتی ہے:

" جو لوگ یہ بہتان گھڑ کر لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں"۔۔۔۔۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا۔ اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔" (آیت ۱۱)

کتنا بڑا طنز ہے، کہ ایک ایسے تہمت الزام جس کے لیے کوئی واضح قرینہ تک موجود نہ تھا وہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور کسی بیرونی دشمن اور حریف کی طرف سے نہیں، بلکہ خود برسوں کی تربیت یافتہ مسلم جماعت کے اپنے اندر سے اٹھا۔ پھر یہ ایک آدھ آدمی کی وقتی لغزش نہ تھی، مہینہ بھر تک ایک ٹولے کا ٹولا ذہنی مد و جزر پیدا کرتا رہا۔ بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے جماعتی ماحول میں یہ کمزوری موجود ہے کہ اس کے معمار ہی اس کی تباہی کی مہم چلا دیں۔ اس فضا میں ایسے رخنے ہیں کہ علمبردارانِ صداقت کی سوسائٹی میں جھوٹ برگ و بار لائے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بہتان نہیں تھا، عصیان کی ایک بہتی گنگا تھی جس سے کسی نے خم اور کسی نے جام بھرا اور کسی نے چلو ہی لیا ۔۔۔ سو جس نے جتنا بھی حصہ لیا اپنے لیے بُرائی ہی سمیٹی۔ پھر اشارہ کیا گیا اُس سرخیلِ فتنہ اور اُس امامِ شر کی طرف جس نے پہلی چنگاری ڈالی تھی اور پھر برابر شعلوں کو دامن سے ہوا دیتا رہا۔ یعنی عبداللہ بن ابی

سورۂ نور سوال کرتی ہے کہ :-

"جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اُسی وقت کیوں نہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔" (آیت ۱۲)

کتنا اخلاقی اپیل ہے اس میں ——— شریفانہ جذبات اور مومنانہ حِس کے لیے کتنا تیز کچوکا ہے ان الفاظ میں! مدعا یہ ہے کہ محض اتنی سی بات کہ اسلامی معاشرہ کی ایک شریف ترین خاتون قافلے سے بچھڑ جاتی ہیں اور اسی معاشرے کا ایک دوسرا معزز رکن اُن کو راستے میں پا کر ساتھ لے آتا ہے، تمہارے لیے درجۂ آخر کی بدگمانی کی بنیاد کیوں بن گئی؟ کیا تم میں سے کوئی مرد و عورت ایک اتفاقی حادثے کے طور پر اس صورت سے دوچار ہوتا تو وہ لازماً اسی پستی میں گرتا؟ کیا اپنے اخلاق و کردار کے بارے میں تمہارا اندازہ یہی تھا؟ کیا تمہارے معاشرے کی سطح اتنی گری ہوئی ہے کہ اس کے دو افراد اگر اتفاقاً علیحدگی میں رہ جائیں تو وہ بدکاری سے ورے ورے نہیں رکتے! اگر تم اپنے بارے میں اس پستی کا تصور نہیں کر سکتے تو تمہیں اپنی جماعت کی ایک بہترین خاتون اور اس کے ایک ممتاز کارکن کے بارے میں ایسا ذلیل تصور باندھنے کا کیا حق تھا؟

اور اس معاشرے کی بڑی اکثریت اس دورِ بحران میں بھی اپنی اخلاقی عظمت پر قائم تھی ورنہ اگر سارا جسم اس زہر کو قبول کر لیتا اور اس کی ذہنی مدافعت کرنے میں عاجز رہ جاتا تو یہ حملہ اس کا شیرازۂ وجود بکھیر کر رکھ دیتا۔ کتنا صحیح ردِّ عمل تھا حضرت ابو ایوب انصاری کا جب ان کی بیوی نے اُن سے ان گندی افواہوں کا تذکرہ کیا وہ کہنے لگے: "ایوب کی ماں! اگر تم عائشہ کی جگہ اُس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟" وہ بولیں "خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی"۔ حضرت ابو ایوب نے کہا "تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا، صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے"[۱]۔

سورۂ نور اس گندے بہتان کو پھیلانے والوں کا دامن پکڑ کر پوچھتی ہے کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا تھا تم نے کیوں نہ ابو ایوب انصاری کا سا ردِّ عمل دکھایا؟

اس کے بعد سورۂ نور قانونی نقطۂ نظر سے سوال اٹھاتی ہے کہ :-

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۳ صفحہ ۳۴۷

"وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں" (آیت ۱۳)

یعنی کسی مرد و عورت کی عصمت کے دامن پر دھبا ڈالنا محض ایک دل لگی نہیں ہے، یہ ایک سنگین معاملہ ہے اور اس پر ایک زندہ نظام معاشرہ میں قانونی کارروائی واجب ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی شریف شہری کے بارے میں اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ اس نے قتل کیا ہے، اس نے چوری کی ہے، اسی طرح ــ بلکہ اس سے بڑھ کر ــ یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں شخص نے بدکاری کی ہے ایک سرسری سی بات نہیں ہے کہ آئی گئی ہو جائے۔ یہ انتہائی ذمہ دارانہ احساس چاہتی ہے۔ ایسے الزام لگانے پر ان کا ثبوت دینا اور ان کے لیے قانونی شہادت فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ اسلامی معاشرہ کے دو شریف اور معزز شہریوں کے متعلق اپنی آنکھوں سے کوئی بات دیکھے بغیر محض افسانہ طرازی کے طور پر ایک بہتان کا چرچا کرتے پھر رہے ہیں، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ ثبوت اور شہادت لائیں، ورنہ قانون کے مطابق وہ خود جھوٹے اور مجرم ہیں۔

پھر سورۂ نور مسلم معاشرہ کے کمزور عنصر کی کمزوری کو نمایاں کرتی ہے کہ:

"(ذرا غور تو کرو، اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جب کہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحٰن اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔" (آیت ۱۵، ۱۶)

یہ کسی بھی معاشرے اور کسی بھی نظام جماعت کی ــ خصوصاً جب کہ وہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح کے لیے قائم ہوا ہے اور اس کے زیر اثر ایک تمدنی و سیاسی تحریک بھی چل رہی ہو ــ بڑی بھاری کمزوری ہے، کہ اس میں بے سرو پا اور بیہودہ اور غیر ذمہ دارانہ باتوں کا آسانی سے چلن ہو سکے۔ کان جو کچھ سنیں، اٹھا کر دل میں رکھ لیں اور دل زبانوں کے حوالے کر دیں اور زبانیں آگے منتقل کرتی چلی جائیں۔ کوئی غور و تامل نہ ہو، کوئی تحقیق نہ ہو۔ کوئی رد و کد نہ ہو اور کسی جگہ جا کر سلسلہ رکے نہیں۔ جو جس کے خلاف جیسے کچھ کلمات بھی کہنا چاہے، بالکل جھوٹ ہو، جو جس کی پگڑی اچھالنا چاہے اسے پوری آزادی ہو اور جو جس کے دامن عفت کی دھجیاں بکھیرنا چاہے ماحول اسے وسیع موقع بہم پہنچا دے۔ اچھا چمن افکار و کردار ہو گا جس میں فتنہ کا مال کانٹے بوتا رہے

اور زبانوں کی کیاریاں کانٹے اگاتی رہیں۔ جس معاشرے میں سرورِ عالم اور عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور صفوان جیسی ہستیاں ایک منافق کے چھوڑے ہوئے شوشے سے محفوظ نہیں رہ سکیں اس میں اور کس کی عزت و آبرو کی خیر ہوگی۔

سورۂ نور کی آواز میں ایک گونج اور پیدا ہوئی :۔

"جو لوگ پاک دامن اور بھولی بھالی ایمان دار عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔" (آیت ۲۳)

اس آیت میں تو گویا حضرت عائشہؓ کے کردار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی۔ ایک ایمان دار اور پاک دامن خاتون جو مزاج کی سیدھی سادی تھیں اور جن کو تصور تک نہ تھا کہ بد چلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے اور جن کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی یہ اندیشہ نہ گذرا ہوگا کہ کوئی ان پر بھی ایک گھناؤنا الزام لگا دے گا۔ اس آیت میں ان کی مظلومیت پوری طرح بول رہی ہے۔ مظلومیت کی یہ تصویر اخلاقی طور پر ایک ایک دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔

بدقسمتی سے جو مخلص، ایمان دار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت اور تحریک کے وفادار افراد اس سیلِ تند و تیز میں بہہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ ہستی بھی جس نے تحریک کی بڑی خدمات انجام دی تھیں اور جس نے اس کے فکری و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا تھا۔ یہ تھے حسان بن ثابت۔ سورہ نور کی الہامی شعاعیں جن حساس لوگوں کے دلوں میں نشتر بن کر اتر رہی تھیں آج حسان بھی تھے ان کے زمرے میں تھے۔ ان کا مرتبہ دائرہ تحریک اور دربارِ نبوت میں خاص اونچا تھا۔ مختلف مواقع پر حضورؐ بطورِ خاص فرمائش کرتے اور توجہ دلاتے کہ شعر و ادب کی جاہلی طاقت کے حملوں کا جواب شعر و ادب ہی سے دیں اور اسلام کی ترجمانی کریں اس سعادت کا تصور کیجیے کہ محسنِ انسانیت نے حسان کو خود منبر پر بٹھایا کہ وہ اسلامی تحریک کا ترانہ الاپیں۔ ان کے اسی مرتبہ کا لحاظ خود حضرت عائشہؓ کو اس قدر تھا کہ اس بحرانی دور کے گذر جانے کے بعد وہ ہمیشہ ان کی عزت کرتی رہیں۔ بسا اوقات ان کو یاد دلایا جاتا کہ اس شخص نے آپ کے خلاف کیچڑ اچھالنے کی مہم میں حصہ لیا تھا تو وہ شرافتِ نفس کے انتہائی بلند مقام سے فرماتیں کہ جانے دو، انھوں نے مخالفِ اسلام شعرا کو رسولِ اکرمؐ، اور اسلامی تحریک کی طرف سے ہمیشہ پرزور جواب دیا ہے اور شاعری کے محاذ پر خاصا جوہر دکھایا ہے۔

لیکن امرِ واقعہ بہرحال یہی ہے کہ تحریک اسلامی کے یہ ممتاز فرد۔ منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنہ کے

گھیرے میں آگئے۔ اس بحران میں ان کا — اپنی جگہ مخلصانہ، مگر تحریک کے لیے نہایت مضر — پارٹ دیکھ کر آدمی یہ درسِ عبرت حاصل کرتا ہے کہ نہ کوئی بہتر سے بہتر شخص اپنے بارے میں یہ ضمانت رکھتا ہے کہ وہ مغالطے کے کسی چکر میں نہ پڑے گا اور نہ دوسری نمایاں ترین شخصیتوں کے بارے میں وہ بے فکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فتنے کے گھیرے میں نہ آئیں گی۔ ہر انسان، بڑا ہو یا چھوٹا ہر وقت شیطان کی کمان سے نکلنے والے تیروں کی زد میں ہے بلکہ فتنے ہر اہم اور بڑے آدمی کے گرد گھیرا ڈالنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تحریکِ اسلامی کی دی ہوئی بنیادی فکر یہ ہے کہ اشخاص کے بجائے اصولوں کے گرد جماعت مجتمع ہو۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے مریدوں کے لیے کتنی بڑی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے تحریکِ اسلامی کے ایک ممتاز فرد کو شکار کر لیا تھا — وہ نفاق کے مارے شر انگیزی کر رہے تھے اور حسان بن ثابت اخلاص کے ساتھ ان کے برپا کردہ فتنے کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریک کے لیے عبداللہ بن ابی کا نفاق اتنا خطرناک اور مضر نہ تھا جتنا حسان بن ثابت کا اخلاص! جو اقدام اخلاص اور نیک نیتی سے کیے جاتے ہیں وہ ضرر رسانی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ بمقابلہ ان اقدامات کے جو دانستہ شرارت کے طور پر کیے جاتے ہیں۔

حسان بن ثابت اس بات کا احساس نہ کر سکے کہ وہ کن لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں، وہ کیسے افراد کے نقطۂ نظر کو پھیلا رہے ہیں، وہ کن شخصیتوں کے خیالات و عزائم کی ترجمانی کر رہے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات معاشرے کے کس عنصر کی حمایت میں جاری ہیں اور جماعت کی کیسی ٹولی کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ مشیتِ ربانی تھی کہ وہ اس معاملہ میں فراستِ مومن سے کام نہ لے سکے۔

عبداللہ بن ابی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کا معاملہ دوری اور بیگانگی کا تھا۔ اس کی کلوخ اندازی قابلِ برداشت تھی، لیکن حسان بن ثابت سے جماعت کی جو یگانگت تھی اس کی وجہ سے جذبات میں کھولاؤ پیدا ہوتا تھا، کہ ہمارے نیام کی ایک تلوار ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ صورت جب بھی کسی تحریک اور تنظیم میں پیدا ہوتی ہے تو صبر کے پیمانے لبریز ہو جاتے ہیں۔ صبر کے پیمانے لبریز ہوئے ہوں گے، مگر مسلم جماعت کا کڑا اخلاقی ڈسپلن جذبات کے آگے روک بنا کھڑا تھا۔ ایک شخصیت ایسی تھی جو ضبط برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ صفوان

بن المعطل تھے جن کو ایک طرف یہ صدمہ تھا کہ حضرت عائشہؓ جو ان کے لیے بمنزلہ ماں کے تھیں ان پر تہمت لگائی جارہی ہے اور دوسری طرف یہ کرب کہ افسانے کا دوسرا سرا خود ان کی ذات سے جوڑا گیا تھا۔ وہ شخص کہ جو اصحابِ بدر میں سے تھا، جس نے تحریک کی خدمات سرانجام دی تھیں، جو جتی ستی ہونے کے لحاظ سے معروف تھا، جس کے کردار میں آج تک کوئی آثارِ فسق و فجور کے نہ پائے گئے تھے اور جس نے ایک بشرمیلے بیٹے کی حیثیت میں حضرت عائشہؓ کو دیکھے بغیر اور سارے راستے بات کیے بغیر پوری احتیاط کے ساتھ پچھلے پڑاؤ سے لشکر گاہ تک پہنچایا تھا، اس کا خون اس زیادتی پر بری طرح کھولا۔

صفوان نے حضرت حسان کے کچھ اشعار سُنے جو منافقین کے لگائے ہوئے بہتانِ عظیم پر مشتمل تھے زبان حضرت حسان کی تھی جسے وقتی طور پر اشرار کے خیالات نے مستعار لے لیا تھا۔ فن ان کا تھا اور ذہن غیروں کا بول رہا تھا۔

صفوان کی ان سے جھڑپ ہوگئی اور انھوں نے تلوار سے وار کر دیا۔ ثابت بن قیس بن شماس نے موقع پر بچاؤ کیا اور صفوان کو پکڑ کر باندھ لیا اور بنی حرث کی حویلی میں لے گئے۔ آخر یہ قضیہ محسنِ انسانیت کی خدمت میں پہنچا۔ حسان اور صفوان دونوں کی طلبی ہوئی۔ صفوان نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! اس شخص نے مجھے اذیت دی ہے اور میرے حق میں سخت بدگوئی کی ہے، سو مجھ پر غصہ سوار ہوا اور میں نے اسے مارا"۔ آپؐ نے ملامت سے حسان کو سمجھایا بجھایا اور بعد میں صفوان کی طرف سے تلوار کے زخم کے بدلے دیت دلوائی[1]

صفوان کی غیرت چونکہ بالکل فطری تھی، سو حسان بن ثابت نرم پڑ گئے اور خدا نے ان کو اس خطرے سے بچا لیا کہ وہ کسی غلط جذبے کی رَو میں آگے ہی آگے بہتے چلے جاتے اور تحریک کے لیے مزید موجب ضرر ہوتے حضرت حسان کا جذبۂ ندامت آخر ایک قصیدے کی صورت میں امڈ پڑا جس میں شعر کے پانی سے انھوں نے اپنے ہی لگائے ہوئے دھبے کو حضرت عائشہ کے دامنِ پاک سے دھونے کی کوشش کی۔

کیا خوب فرمایا:

حَصَانٌ، رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ
وَتُصْبِحُ غَرْثَى مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۳۵۲

مُهَذَّبَةٌ قَدْ طَيَّبَ اللّٰهُ خِيمَهَا!
وَطَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ سُوْءٍ وَبَاطِلِ!
فَاِنَّ الَّذِیْ قَدْ قِيْلَ لَيْسَ بِلَائِطٍ
وَلٰكِنَّهُ قَوْلُ امْرِئٍ بِیْ مَاحِلِ

"وہ ایک عفت مآب خاتون ہیں۔ پردہ نشین۔ ہر شک و شبہ سے بالاتر! وہ اس سے پاک ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کے عزت و ناموس سے تعرض کریں، وہ شائستہ اطوار ہیں، خدا نے ان کو مزاج کے لحاظ سے نکھارا اور نتھارا ہے اور ان کو گناہ اور باطل سے پاک کیا ہے، وہ جو کچھ کہ اب تک کہا جا چکا ہے وہ موصوفہ پر چسپاں ہونے والا ہرگز نہیں ہے، وہ تو ایک ایسے شخص کی کہی ہوئی بات تھی جس نے میرے سامنے نمک مرچ لگا کر اور جھوٹ گھڑ کر چغل خوری کی تھی"[1]

پھر سورۂ نور نے ایک معاشرتی حقیقت کو اصولی استدلال کے طور پر مسلم جماعت کے سامنے کھول کر رکھا کہ:

"خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ اُن کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو گھڑنے والے گھڑتے ہیں" (آیت ۲۶)

یعنی ازدواج کے لیے یوں بھی ذہنی و اخلاقی لحاظ سے جوڑ تلاش کیا جاتا ہے اور نفسیاتی طور پر آدمی کی نگاہِ انتخاب وہیں ٹکتی ہے جہاں اسے اپنے کردار کا عکس نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے کسی اصول و مقصد کو لے کر جو لوگ ساری متاعِ حیات اس میں لگا دیتے ہیں وہ ازدواجی رابطے کے لیے بھی ایسا ہی رفیق تلاش کرتے ہیں جو زندگی کے مشن میں ممد اور مفید ثابت ہو سکے۔ پھر عالمگیر پیمانے کی یہ تجربی صداقت کیسے نظر انداز کی جا سکتی ہے کہ نباہ اور صلح و سازگاری کسی جوڑے میں جبھی ہوتی ہے کہ قلب و نظر کا جوڑ میل پیدا ہو جائے اور ذہن و کردار میں یکسانی ہو، ورنہ از اول تا آخر تصادم رہے گا۔ یہ آیت بہتان طرازوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ تم نے یہ نہ دیکھا کہ دائرۂ ازدواج میں تحریکِ اسلامی کے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۳۵۴-۳۵۵

بلند مرتبت رہنما کی نگاہِ انتخاب جس ہستی پر پڑی تھی جس سے گہرا قلبی لگاؤ تھا اور جس کے ساتھ قلب و نظر کی سازگاری و ہم آہنگی ایک معیاری نمونہ تھی وہ کیا تمام تر ملمع کا کرشمہ تھی کہ ایک آن میں ملمع اتر گیا اور کھوٹ باقی رہ گیا ؟

ایک پاکیزہ گھرانے کی نورِ چشم جس کے ماں باپ تحریکِ اسلامی کے اولین علمبرداروں میں سے تھے اور جس کا بچپن اسی تحریک کی نت امڈتی گھٹاؤں کے سائے میں تربیتِ فکر و نظر پاتے گذرا پھر جسے سرکارِ رسالتمآب کے ساتھ یکجائی کا شرف حاصل ہوا ، جسے قریب ہو کر آپؐ کے نورانی کردار سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑھ کر موقع ملا ، جسے محسنِ انسانیت کی تربیت کا فیضانِ خاص حاصل ہوا اور جس کے تجربے میں بارہا وحی و الہام کی کرنوں کی بوچھاڑیں ہوتی رہیں ۔ کیا ایسے پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی خاتون کا کردار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ ایک غلیظ ترین بہتان کا جامہ اس کے قامت پر راست آجائے ؟ درآنحالیکہ اس کے والدین کو اور نہ سرورِ عالم کو اور نہ عام معاشرے کو اس کے بارے میں اس بہتان طرازی سے قبل ایسا کوئی اندازہ ہو سکا ہو ۔ برسوں سے ایک کردار جو حسن و پاکیزگی کے خطوط پر ارتقا کرتا رہا ہو' یہ کیسے ممکن ہے کہ یکایک اس کے اندر سے ایک بدترین قسم کی گھناؤنی حرکت نمودار ہو جائے کہ جس کے کوئی ابتدائی آثار کبھی کسی کے سامنے نہ آئے ہوں ۔ ایک شجرۂ طیبہ کمالِ شادابی کے ساتھ پاکیزہ برگ و بار دیتے دیتے یکایک ایک دن خبیث پھل لے آئے ۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے ؟

قانون حرکت میں آتا ہے | سورۂ نور کی روشنی سے اہلِ ایمان کے دلوں کی نگریاں جگمگا اٹھیں ، رائے عام یکسو ہو گئی ، معاشرہ نے مدوجزر کے ایک لمبے دور کے بعد اپنی سطح کو پرسکون اور ہموار کر لیا ۔ سورۂ نور حدِ قذف کے قانون کا کوڑا اپنے ساتھ لائی تھی ، سو جن جن اصحاب نے سرگرمی سے بہتان طرازی کی اس مہم میں حصہ لیا تھا اور جو اپنے اخلاص کی وجہ سے نادم ہو کر جرم کے اقراری بھی ہوئے اور جن کے بارے میں شہادت بھی موجود تھی انھوں نے اپنی پیٹھیں اسلامی نظامِ عدل و قانون کے سامنے پیش کر دیں اور اسی اسی کوڑے کھا کر انھوں نے اپنے ضمیروں کی پاکیزگی کو بحال کر لیا ۔ یہ تھے مسطحؓ ابن اثاثہ ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش لیکن اصل بانیٔ شر و فساد قانون کی گرفت سے بچ نکلا ! — البتہ رائے عام کی نگاہ میں اس کی فطرت کی

پستی مکمل طور پر آشکارا ہوگئی اور اسلامی معاشرے نے اسے بے وقعت بنا کر ایک طرف ڈال دیا۔

غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں اور کس ماحول اور کس جماعت میں انبیا کے خصوصی استثنیٰ کے ساتھ انسانی فطرت مقامِ امتحان سے نکل کر عصمتِ کاملہ کی قدسیانہ سطح پر پہنچ سکتی ہے لیکن قصۂ آدم کے دو متقابل کرداروں کی روشنی میں دیکھیں تو غلطی سرزد ہوجانے پر غلط کار کے سامنے دو راستے کھل جاتے ہیں ؛ ایک شیطان کا پسندیدہ راستہ — کہ غلطی ہوجانے کے بعد اس پر آدمی ڈٹ جائے اور الٹا اور بپھر جائے، دوسرا آدم علیہ السلام کی فطرتِ سلیم کا پسندیدہ راستہ — کہ غلطی کے بعد نادم ہو کر اپنی اصلاح کرلی جائے۔ سو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی تو شیطانی راستے کی طرف مڑ گئے اور حسّان اور مسطحؓ اور حمنہ نے اصلاح کا راستہ اختیار کیا۔

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

سلسلۂ واقعات کو نگاہِ تصور میں تازہ کریں اور اپنے آپ کو مدینہ کے اس ماحول میں لے جائیں جس میں یہ بہتان کا جھکڑ مہینہ بھر چلتا رہا تھا تو ایک ہولناک اور دردناک سماں سامنے آتا ہے۔ ایک تحریک جو ایک ایک فرد کو آہستہ آہستہ ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کاروانِ انقلاب کی شکل اختیار کرسکی تھی جس نے کتنی ہی مردآزما منزلوں کو پار کرکے اسلامی ریاست کا ایک چھوٹا سا گھروندا انسانیت کو پناہ دینے کے لیے سالہا سال کے لمبے دورِ فساد کے بعد کرۂ ارضی کے ایک گوشے میں تیار کیا تھا، جو چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں تھی اور جس کو ہر آن کسی نہ کسی جانب سے فوج کشی کا خطرہ تھا اور جو خود اپنے غیر مسلم شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی شرارتوں کے گھیرے میں تھی، اس کے بالکل اندرون سے اگر ایک تباہ کن طوفان ابل پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کونسا موقعِ اضطراب ہوسکتا تھا۔

لیکن قرآن نے تسلی دلائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں — "اسے اپنے حق میں موجبِ ضرر نہ سمجھو، یہ تمہارے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے" (نور - ۱۱)

اور واقعہ یہ ہے کہ اصولی و انقلابی تحریکوں کے لیے ذہنی شکست و ریخت کے ہنگامے — خواہ باہر سے اٹھیں، خواہ اندر سے — انجام کار کے لحاظ سے مزید فلاح و ترقی تعمیر و اصلاح اور قوت و سطوت کا سامان بن کے رہتے ہیں۔ جس طرح اونچا مقصد رکھنے والے صلاحیت دار افراد کے لیے حوادثِ روزگار معاونِ ترقی

رہتے ہیں اسی طرح روحِ فکر و عمل رکھنے والی تحریکوں کے لیے مخالفتوں اور مزاحمتوں اور فتنوں کے طوفان وسیلۂ استحکام و ارتقا بن جاتے ہیں۔ جس نظامِ جماعت میں نصب العین کا شعور کارفرما ہو، جس کا ایک اجتماعی ذہن بن چکا ہو، جس کا فکری و اخلاقی مزاج پختہ ہو چکا ہو، جس کے سر پر ایک فعّال اور بیدار مغز قیادت بیٹھی ہو اور جس میں فتنوں اور مخالفتوں کے سرحد و جزر پر نظر رکھنے والے، طوفانوں کو تہ تک پڑھ لینے والے اور ان کے مقابل میں سینہ سپر ہو جانے والے مضبوط کارکن موجود ہوں اور جس کی رائے عام کسی فاسد نظریہ و اقدام کو اپنے دائرے میں چلنے نہ دے۔ وہ نظامِ جماعت سر مخالفت و شرارت سے بھی کچھ کما کر نکلتا ہے۔

چنانچہ پروپیگنڈے کے اس گندے طوفان کی موجوں سے بھی، مدینہ کی اس عظیم المرتبت اسلامی جماعت نے کئی پہلوؤں سے اپنے دامن میں خیر و فلاح کے موتی سمیٹے اور وہ اس سے نکلی تو پہلے سے زیادہ مضبوط اور پہلے سے زیادہ چاق و چوبند تھی۔

نیکی اور سچائی کی اس نورانی تحریک کے علمبرداروں کو انسانیت کی ان خطرناک اور وسیع الاثر کمزوریوں کا علم براہِ راست تلخ تجربے کے ذریعے ہوا جس کا تصور بھی کسی خانقاہ میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی بصیرت کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ جماعتی زندگی کے وہ رخنے پوری طرح سامنے آ گئے جن میں سے معاشرے کو تہ و بالا کر دینے والے مفاسد کا داخلہ ہوتا ہے۔ حضور سرورِ عالم اور ان کے رفقا کے سامنے جماعت کے مختلف عناصر۔ نفاق کے روگی، ضعیف الایمان لوگ، سطحی اور جذباتی مزاج رکھنے والے، نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط رَو میں بہہ جانے والے اور دشمنوں کا شکار ہو جانے والے سادہ لوح افراد۔ سبھی الگ الگ نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ خصوصیت سے نفاق کے شیطان نے جماعت کے اندر جو ایک الگ ٹکڑی منظم کر دی تھی اس کے بارے میں پوری طرح وضاحت ہو گئی کہ وہ کہاں تک جا سکتی ہے۔

عملی تجربے کے میدان میں جماعت کے اندرونی ماحول کی ان کمزوریوں کے سامنے آ جانے سے وہ خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف نئی اخلاقی ہدایات دے کر تربیت کا انتظام کیا گیا اور دوسری طرف ایسے معاشرتی احکام کا نفاذ کیا گیا جو گوناگوں مفاسد سے جماعت کو بچانے کا ذریعہ

ہو سکتے تھے۔ تیسری طرف نئے قوانین اور حدود و تعزیرات پر مشتمل ایک کڑا ضابطہ نازل ہوا جو ہمیشہ کے لیے انسانیت کی اجتماعی فلاح و بہبود کا ضامن بنا۔

اس واقعہ نے مدینہ کی سوسائٹی کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا، اس کی اخلاقی حس کو چوٹیں لگا کر بیدار اور اس کی جماعتی حمیت و غیرت کو تازیانے برسا کر متحرک کر دیا۔ پوری جماعت نفاق کے اس اضطراب انگیز حملے سے نکلی تو اس کا ایک ایک فرد پہلے سے زیادہ چوکنا اور مضبوط تھا۔

اس ہنگامہ کے طوفان سے گذرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ مظلوم ذات خود محسنِ انسانیت ہی کی تھی، لیکن جس عالی ظرفی، حوصلہ مندی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ حضورؐ نے اپنے ٹھنڈے سے غیر جذباتی اور باوقار طرزِ عمل سے کیا وہ انسان کو حیرت میں ڈال دینے والا ہے اور اس میں حضورؐ کے بعد اسلامی تحریک اور نظامِ جماعت کی قیادت کرنے والوں کے لیے ایک جذبہ پرور نمونہ پایا جاتا ہے۔ کتنی بڑے پیمانے کی ایذا تھی جو سہنے والے نے محض اس قصور میں سہی کہ وہ دنیائے انسانیت کو ایک نظامِ رحمت سے مالا مال کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو سارے انسانوں کے ناموس بچانے کے لیے اٹھا تھا اسے زمانے نے صلہ یہ دیا کہ خود اس کے ناموس پر گندگی اچھال دی۔ کوئی دوسرا اس چکر میں پڑا ہوتا تو یا تو مخالفین کو پیس کر رکھ دیتا، یا پھر بیزار اور مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا۔ مگر وہ پیکرِ صبر و عزیمت فرض کی راہ پر چلتا رہا، چلتا رہا —— کانٹے اس کے قدموں کو لہولہان کرتے رہے اور وہ پھر بھی آگے ہی بڑھتا رہا۔

سیرتِ پاک کا یہ سلسلۂ مضامین بعض پریشانیوں کے سبب یہاں آکر رک گیا ہے۔ ایک عرصہ سے آگے کا کام نہیں کیا جا سکا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ دوبارہ کب اسے بحال کیا جا سکے گا۔ فی الحال یہ سلسلہ یہیں ختم کیا جا رہا ہے۔ (ن۔ص)

اسلامی تحریک میں کارکنوں کے باہمی تعلقات

(۲)

ایثار جب ایک مسلمان اپنے بھائی کے لیے نہ صرف یہ کہ وہی پسند کرتا ہے جو اپنی ذات کے لیے بلکہ اس کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے تو کردار کی یہ صفت ایثار ہے اور یہ دوسری بنیادی صفت ہے۔

ایثار کا لفظ اثر سے نکلا ہے اور اس کے معنی قدم رکھنے اور ترجیح دینے کے ہیں یعنی مسلمان اپنے بھائی کی بھلائی اور بہتری کو اپنے نفس کی بھلائی اور بہتری پر ترجیح دے۔ اپنی ضرورت کو موخر کر کے دوسرے کی ضرورت پوری کر دے۔ خود تکلیف اٹھائے دوسرے کو آرام پہنچائے۔ خود بھوکا رہے دوسرے کا پیٹ بھر دے اپنی طبیعت اور مزاج پر ناگواریاں جھیل لے لیکن اپنے بھائی کے دل پر حتی الوسع کسی ناگواری کا میل نہ آنے دے۔

یہ صفت ایک بلند اخلاقی فضیلت ہے اور ہر شخص سے اس کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کی بنیاد پر حقوق تو متعین نہیں کیے گئے لیکن خود اس کی اور اس کی بنیاد پر بے شمار اخلاقی فضائل کی تاکید کی گئی ہے۔

یہ ایثار سب سے پہلے ضروریات کے دائرہ میں ہونا چاہیے پھر آسائش و آرام کے دائرہ میں اور پھر مزاج کے تقاضوں کے دائرہ میں یہ آخری چیز خاصی اہم ہے۔ تمام انسان مختلف المزاج ہوتے ہیں اور اس طرح ان کے تقاضے مختلف النوع۔ اور اگر ہر انسان اپنے مزاج کے تقاضوں پر اڑ جائے تو معاشرہ درہم برہم ہو جائے۔ لیکن اگر وہ دوسرے کے ذوق پسند اور دلچسپی کو ترجیح دینا سیکھ جائے تو پھر انتہائی شیریں اور مخلصانہ تعلقات وجود میں آتے ہیں۔

پھر اس ایثار کا بلند تر درجہ ہے جب ایک آدمی خود تنگی اور عسرت کی حالت میں ہو اور پھر وہ

اپنے بھائی کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے ۔ رسول اللہ کے ساتھیوں کی زندگی ان واقعات سے بھری پڑی ہے اور قرآن نے ان کی اس صفت کی تعریف کی ہے ۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر ۔ ۱) اور اپنے نفس پر (دوسروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو ۔

انصار نے جس طرح باوجود اپنی عسرت کے مہاجر بھائیوں کا استقبال کیا اور ان کو اپنے درمیان جگہ دی ، یہ ایثار کی اچھوتی مثال ہے ۔ ایک واقعہ حضرت ابو طلحہ انصاری کا ہے جو اس آیت کی شان نزول کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور جس میں اس کا بہترین انطباق پایا جاتا ہے ۔

" ایک آدمی ایک دفعہ رسول اللہ کے پاس بھوکا آیا کاشانہ نبوی میں کچھ نہ تھا ۔ آپ نے فرمایا جو شخص اس کو آج کی رات مہمان بنائے گا خدائے تعالےٰ اس پر رحم فرمائے گا حضرت ابو طلحہ اس کو اپنے گھر لے گئے لیکن گھر جا کر بی بی سے معلوم ہوا کہ اتنا ہی کھانا ہے کہ مہمان کا پیٹ بھر سکے ۔ بولے ، " بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر یہ ظاہر کریں گے ہم کھا رہے ہیں " چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا صبح کو رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا خدائے تعالےٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا ۔ اور یہ آیت سنائی ۔ (بخاری مسلم)

یہ مالی تنگی میں ایثار کا واقعہ تھا لیکن اس سے زیادہ نادر واقعہ ایک جہاد کا ہے جو شان ایثار کی انتہائی شکل ہے ۔ جب ایک زخمی کے پاس میدان جنگ میں پانی پہنچایا گیا تو پاس سے کراہنے کی آواز آئی انھوں نے کہا پہلے ان کے پاس لے جاؤ ۔ جب ان کے پاس پہنچے تو پھر یہی واقعہ پیش آیا اور انھوں نے بھی مرتے وقت اپنے ساتھی کو اپنے اوپر ترجیح دی اس طرح چھٹے آدمی تک نوبت آئی اور ہر ایک دوسرے کو اپنے پر مقدم کرتا رہا تھا جب چھٹے کے پاس پہنچے تو وہ ختم ہو چکے تھے اور جب پہلوں کے پاس واپس آئے تو سب جان بحق تسلیم ہو چکے تھے ۔ رحمھم اللہ

اس طرح ایثار کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے لیے کمتر چیز پر راضی ہو جائے اور اپنے ساتھی کو بہتر چیز دے دے ۔ ایک دفعہ رسول اللہ ایک جنگل میں جا رہے تھے آپ نے دو مسواکیں کاٹیں ایک سیدھی تھی

اور ایک ٹیڑھی۔ آپ کے ساتھ ایک صحابی تھے آپ نے سیدھی مسواک انہیں دے دی اور خود ٹیڑھی رکھ لی انھوں نے کہا یا رسول اللہ یہ بہتر ہے اور آپ کے لیے اچھی ہے آپ نے فرمایا "جو کوئی شخص کسی سے ایک ساعت بھی صحبت رکھتا ہے تو اس سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گا کہ اس نے حقِ صحبت کا خیال رکھا یا اس کو ضائع کیا (کیمیائے سعادت) یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ایثار بھی صحبت کا ایک حق ہے۔

سیرت کی دو اور اہم بنیادی صفات جن کو اگر مومن اختیار کرلے تو نہ صرف یہ کہ تعلقات میں خرابی کو کہیں سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے گا بلکہ یہ انتہائی شیریں ہو جائیں گے عدل اور احسان ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے بحیثیت حکم کے ارشاد کیا:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل) اللہ تعالیٰ عدل اور احسان پر کاربند رہنے کا حکم دیتا ہے۔

اللہ حکم دیتا ہے (ان اللہ یامر) کا انداز بیان قابل غور ہے۔

عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن و تناسب قائم ہو اور دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے" اور عدل کے حکم کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی، سیاسی و تمدنی حقوق پوری پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں" یعنی ایک مسلمان اپنے بھائی کے وہ تمام حقوق ادا کرے جو شریعت نے عائد کیے ہیں اپنے معاملات اس طرز پر طے کرے جس طرز پر شریعت چاہتی ہے۔ سلوک اس نوعیت کا ہو جس نوعیت کا شریعت تقاضا کرتی ہے اور برتاؤ میں وہی روش اختیار کرے جس کا حکم شریعت نے دیا ہے اس لیے کہ شریعت ہی وہ نظام ہے جس میں عدل کے تمام تقاضے بکمال حسن و خوبی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

وانزل معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید)

اسی طرح اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی سے برائی کا بدلہ لے تو بس اتنا ہی لے جتنی برائی کی گئی ہے جو اس سے بڑھا اس نے عدل سے تجاوز کیا۔

عدل کی مزید تشریح جو اس کے تصور کو بالکل مکمل کر دیتی ہے اس حدیث میں ہے جس میں نبی کریم صلعم نے ان نو باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا حکم اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ :

كَلِمَةُ الْعَدْلِ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَاءِ — غضب کی حالت ہو یا ناراضگی کی بہرصورت عدل کے کلمے پر اہل

دراصل کمال سیرت کی بنیادی علامت یہ ہے کہ آدمی کی قلبی کیفیت کچھ بھی ہو لیکن وہ عدل کے راستہ سے سرمو نہ ہٹے اور اس میں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کے کردار میں اتنی طاقت ہو کہ خواہ آدمی کے دل میں اپنے بھائی کی طرف سے غبار اور میل ہو لیکن پھر بھی وہ اپنے معاملات ، برتاؤ اور رویہ کو شریعت کے تقاضوں سے ہٹنے نہ دے ۔ اس عدل کے بعد اگلی چیز احسان ہے جو عدل سے زائد ایک چیز ہے ۔

احسان | اس کی اہمیت باہمی تعلقات میں عدل سے بھی زیادہ ہے عدل اگر تعلقات کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال ہے عدل اگر تعلقات کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں شیرینیاں اور خوشگواریاں پیدا کرتا ہے کوئی تعلق صرف اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر فریق ناپ تول کر کے دیکھتا رہے اور اپنے واجب الوصول حقوق میں کسی طرح کی کمی اور دوسروں کے واجب الادا حقوق میں کسی طرح کا اضافہ گوارا نہ کرے ۔ ایسے ایک کھرے تعلق میں کشمکش تو نہ ہو گی مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاق و خیر خواہی کی نعمتوں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی ہیں ۔ یہ نعمتیں احسان سے حاصل ہوں گی جس سے مراد ہے نیک برتاؤ ، فیاضانہ معاملہ ، ہمدردانہ رویہ ، رواداری ، خوش خلقی ، درگزر ، باہمی مراعات ، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر ہی راضی ہو جانا ۔

اس احسان کا تصور بھی نو باتوں والی حدیث کی تین باتیں مکمل اور واضح کرتیں ہے کہ :

اَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَ اُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَ اَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ

جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں اور جو مجھ کو (حق سے) محروم کرے میں اسے (اس کا حق) دوں اور جو میرے اوپر ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں ۔

یعنی کردار کی یہ صفت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ آدمی اپنے بھائی کو بھلائی کا بدلہ اس سے

زائد بھلائی سے دے بلکہ یہ بھی کہ اگر وہ برائی کرے تو اس کا جواب بھی بھلائی سے دے۔

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

ان چار صفات کے بعد پانچویں چیز وہ ہے کہ جس کے لیے میں رحمت کا لفظ استعمال کروں گا لیکن جس کے لیے نہ معلوم کتنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

رحمت رحمت کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کی تصویر کھینچنے کے لیے اس لفظ کو اختیار کیا ہے اور یہ چیز اس کے وسعت معانی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (فتح)	محمد اللہ کے رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں اور باہم سراپا رحمت۔

اس صفت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہم اس کو دل کی نرمی اور گداز سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے نتیجہ میں آدمی کا رویہ اپنے بھائی کے لیے انتہائی محبت، گرمجوشی، سوز، شفقت اور الفت کا مظہر ہو جاتا ہے اس کے بھائی کو اس سے ذرہ برابر بھی کوئی ایذا، تکلیف یا ٹھیس پہنچنے کا تصور بھی اس کے لیے کرب ناک ہوتا ہے۔ یہ رحمت ہی کی صفت ہے جو آدمی کو ہر دلعزیز بناتی ہے اور انسانوں کو اس کی طرف پروانہ وار کھینچتی ہے۔ رسول اللہ کی اہم صفات میں سے ایک صفت یہی ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور دعوت و تربیت کے سلسلہ میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ)	بےشک تمہارے پاس خود تم میں سے رسول آیا، تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو ان کو گراں ہوتی ہے تمہاری بھلائی پر وہ حریص ہے اور مومنین کے لیے سراپا راحت و رحمت۔

اور سورہ آل عمران میں بتایا ہے کہ اگر آپ کا دل نرم نہ ہوتا تو لوگ کبھی آپ کے گرد جمع نہ ہوتے اور یہ دل کی نرمی اللہ کی رحمت ہے فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ	اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم دل واقع ہوئے

فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۱۵۹)

ہیں اگر کہیں بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے ۔

ایمان کا نتیجہ الفت ہے اور الفت سخت دلی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی لہٰذا ایک مومن جو سراپا الفت ہوتا ہے۔ سراپا نرمی بھی ہوتا ہے ورنہ اس کے ایمان میں کوئی بھلائی نہیں اس حقیقت پر رسول اللہ نے یوں روشنی ڈالی ہے ۔

المومن مالف ولا خیر فیمن لا یالف ولا یولف ۔

مومن محبت و الفت کا پتلا ہوتا ہے اور جو نہ محبت کرتا ہے اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے

اور اس لیے یہ فرمایا کہ :

من یحرم الرفق یحرم الخیر (عن جریر فی المسلم مشکوٰۃ)

جو نرمی سے محروم کیا گیا وہ بھلائی سے محروم کر دیا گیا ۔

اس بات کی مزید تشریح یوں کی :

من اعطی حظہ من الرفق اعطی حظہ من خیر الدنیا والاخرۃ

کہ جس شخص کو نرمی میں سے اس کا حصہ دیا گیا اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائی میں سے اس کا حصہ دے دیا گیا ۔

(عن عائشہ شرح السنہ مشکوٰۃ ۴۳۱)

آپ نے ایک دفعہ تین جنتی آدمیوں میں سے ایک شخص کو گنایا جو اپنے رشتہ داروں اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور رقیق القلب ہو (رحیم رقیق القلب لکل ذی قربی ومسلم (رواہ مسلم) یہ اس لیے کہ رحمت سے محرومی بدبختی ہے اور جو زمین پر بندوں پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے اور جو زمین پر اللہ کے بندوں پر رحمت کرتا ہے اس کے لیے اللہ کی رحمت واجب ہو جاتی ہے چنانچہ فرمایا کہ :

لا تنزع الرحمۃ الا من شقی

رحمت کسی سے نہیں چھینی جاتی مگر اس سے جو بدبخت ہو

(عن ابی ہریرہ احمد الترمذی مشکوٰۃ ۴۲۳)

اور مزید یہ کہ :

الراحمون یرحمهم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحکم من فی السماء

جو رحم کرنے والے ہیں رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان والا تم پر رحم کرے۔

(عن عبداللہ بن عمر رواہ ابوداؤد الترمذی مشکوٰۃ ۴۲۳)

اس نرمی و رحمت کے جو دو مختلف پہلو چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں یعنی شفقت و عزت اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ابی داؤد و ترمذی ۔ مشکوٰۃ ۴۲۳)

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ایک مسلمان اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات میں سراپا نرمی ہوتا ہے اور اپنے معاملات میں اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کے دل کو خوش رکھے اور اس کو تکلیف نہ ہونے دے اور اس کا ہر جائز مطالبہ پورا کر دے۔ اس امر کو رسولؐ اللہ نے ایک مثال سے یوں سمجھایا کہ:

المومنون هینون لینون کالجمل ان قید انقاد وان انیخ علی صخرة استناخ (رواہ ترمذی عن مکحول مشکوٰہ ۴۳۲)

مومن بردبار اور نرم دل ہوتے ہیں، اس اونٹ کی مانند جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو اگر کھینچا جائے تو کھنچتا چلا جائے اور پتھر پر بیٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے۔

قرآن نے بڑے مختصر سے انداز میں اس پوری کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔ (اذلة علی المومنین) دراصل یہ رحمت سیرت کی وہ صفت ہے جو تعلقات میں ایک نئی روح ڈال دیتی ہے اور ان کے حسن و جمال کو مکمل کرتی ہے اور ایک شخص جو ایک مرتبہ اس رحمت سے لطف اندوز ہو جاتا ہے پھر اس کا دل اس تعلق کو توڑنے کے لیے مشکل سے راضی ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کو یہ نعمت ملتی ہے۔

عفو | عفو کا مفہوم معاف کر دینا ہے لیکن اس مفہوم میں وہ بہت ساری چیزیں شامل ہیں جو الگ بھی شمار ہوتی ہیں لیکن ان کا چونکہ اس صفت سے گہرا تعلق ہے اس لیے ہم نے انہیں اس کے تحت شامل کر دیا ہے، مثلاً غصہ کا ضبط کرنا، صبر و تحمل اور بردباری وغیرہ۔

جب دو آدمیوں کا تعلق قائم ہوگا تو ایک فطری امر ہے کہ ہر ایک سے بہت ساری ایسی چیزیں سرزد

ہوں گی جو دوسرے کے لیے ناگواری، تلخی، تکلیف اور اذیت کا باعث ہوں گی جن پر اسے غصہ آئے گا اور جن میں سے بعض پر اسے قانوناً بدلہ لینے کا حق بھی ہو گا۔ ایک پیار و محبت کا تعلق اپنے استحکام کے لیے اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر محبت غالب آئے اور ایک بھائی میں اتنی وسیع القلبی ہو کہ وہ اپنے غصہ کو پی جائے اور باوجود انتقام کی قدرت کے انتقام نہ لے اور اس طرح عفو کی روش پر کاربند ہو۔ رسول اللہ کا یہ خاص شیوہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے آپ کو بے شمار جگہ نصیحت کی ہے۔

وخذ العفو فاعف عنهم واستغفر لهم

اللہ مسلمانوں کو تقویٰ کی صفات بتاتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ:

والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس (آل عمران)

جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچے یا کوئی نقصان ہو تو سب سے پہلے غصہ اس کے دل و دماغ پر قابو پانے کی کوشش شروع کرتا ہے اور اگر غصہ دل و دماغ پر قابو پالے تو پھر عفو تو درکنار آدمی ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ آیندہ کو خوشگوار تعلقات کی امید بالکل منقطع ہو جاتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے آدمی کو اپنا غصہ پی جانے کی فکر کرنی چاہیے۔ جب ہی وہ ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کر سکے گا اور پھر اگر عفو کی پالیسی اختیار نہ بھی کرے تو کم از کم عدل سے تو تجاوز نہ کرے گا۔ رسول اللہ نے مختلف فرمودات میں اس کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اس کو دبا دینے کی ترغیب دی ہے فرمایا:

ان الغضب ليفسد الايمان كما يفسد الصبر العسل (بیہقی مشکوٰۃ ۴۳۴، ۴۳۳)	بے شک غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر ڈالتا ہے جس طرح ایلوہ شہد کو۔
ما تجرع عبد افضل عند الله عزوجل من جرعة غيظ يكظمها ابتغاء وجه الله تعالىٰ۔ (رواہ احمد عن ابن عمر مشکوٰۃ ۴۳۴)	بندہ کوئی گھونٹ نہیں پیتا جو اللہ کے نزدیک اس غصہ کے گھونٹ سے زیادہ بہتر ہو جو وہ خدا کی خوشنودی کی خاطر پی جاتا ہے۔

اس طرح آپ نے صبر کی تعلیم دی اور یہ بتایا کہ سب سے بہتر رویہ یہ ہے کہ آدمی ایذاؤں پر صبر کرے

اور مل جل کر رہے بجائے اس کے کہ قطع تعلق کرے آپ نے فرمایا:

المسلم یخالط الناس ویصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالطھم ولا یصبر علی اذاھم۔ (من ابن عمر ترمذی وماجہ) (مشکوٰۃ ۴۳۲)

وہ مسلمان جو لوگوں سے ملا جلا رہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرے اُس سے بہتر ہے جو ملنا جلنا چھوڑ دے، اور ایذاؤں پر صبر نہ کرے۔

ایک دفعہ حضرت ابوبکر کو نصیحت کرتے ہوئے آپ نے منجملہ اور باتوں کے یہ کہا کہ:

عبد اظلم بمظلمۃ فیغضی عنھا للّٰہ عزوجل الا اعزاللّٰہ بھا نصرہ (بیہقی ابوہریرہؓ)

جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور وہ صرف خدا کی رضا کے لیے خاموش رہے تو اللہ اس کی زبردست مدد کرتا ہے۔

صبر سے آگے مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو خوش دلی کے ساتھ معاف کردے باوجود اس کے کہ وہ انتقام اور بدلہ کی طاقت رکھتا ہو۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے سوال کیا بندوں میں کون تیرے نزدیک زیادہ عزیز ہے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

من اعز عبادك عندك قال من اذا قدر غفر (عن ابوہریرہ بیہقی)

وہ شخص جو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کردے۔

اور اسی طرح جو آدمی اپنے بھائی کا عذر نہ قبول کرے اس کو یہ وعید سنائی اور فرمایا کہ:

من اعتذر الی اخیہ فلم یعذرہ اولم یقبل عذرہ علیہ مثل خطیئۃ صاحب مکس۔ (عن جابر رواہ بیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ۴۲۹)

جس نے اپنے بھائی سے اپنے قصور کا عذر کیا اور اس نے اس کو معذور نہ سمجھا یا اس کا عذر قبول نہ کیا تو اس پر اتنا گناہ ہوا جتنا (ایک ناجائز) محصول وصول کرنے والے پر۔

اور آخرت میں بھی ایسے شخص کے لیے بہترین اجر ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

من کظم غیظاً وھو یقدر علی ان ینفذہ دعا اللّٰہ علی رؤس الخلائق یوم القیمۃ حتیٰ یخیرہ فی ای حور

ترمذی و ابوداؤد، عن سہل بن معاذ، مشکوٰۃ ۴۳۴

جس نے غصہ ضبط کرلیا اس حال میں کہ وہ اسے پورا کرنے کی قدرت رکھتا تھا قیامت کے دن خداوند اسے تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور جس حور کو چاہے اسے انتخاب کرنے کا اختیار دے دے گا۔

جو دنیا میں معاف کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف کرے گا۔

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم
چاہیے کہ وہ عفو و درگذر سے کام لیں کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے۔ اللہ تعالے بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (نور)

برائی کے برابر برائی سے بدلہ لینے کا حق ہے لیکن جو معاف کردے تو اس کا اجر خاص اللہ کے ذمہ ہے۔

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین (شوریٰ)
برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے پس جس نے معاف کیا اور مصالحت کی اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

عفو کی یہ صفت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ بڑے عزم کا کام ہے۔

ولمن صبر وغفر ان ذالک من عزم الامور
اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے

لیکن یہی وہ چیز ہے جو تعلقات میں بڑی بلندی اور پاکیزگی پیدا کر دیتی ہے اور اس لیے یہ ایک انتہائی اہم صفت ہے۔

دو مزید صفات کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے ایک باہمی اعتماد اور دوسرے قدر و قیمت کا احساس

اعتماد اعتماد کا پورا پورا تصور ولایت کا وہ لفظ اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو قرآن نے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی تعبیر کے لیے استعمال کیا ہے۔ دراصل ولی کہتے ہی اس کو ہیں جو کاملاً قابل اعتماد ہو۔ جس کو آدمی اپنے تمام راز اور تمام معاملات پورے اطمینان سے سپرد کر سکے۔ اخوت کے اس تعلق کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرے اور ان کو اپنے زندگی کے معاملات میں برابر کا شریک بنائے۔

(باقی)

اِسلامی ریاست

اسلامی معاشرہ اور اسلامی قومیت

مولانا امین احسن اصلاحی

اخوت اور بھائی چارگی کی اس عمارت میں جتنی اینٹیں بھی لگائی گئیں۔ سب پر اسلام کا چھاپ تھا۔ کسی غیر اسلامی روڑے یا پتھر کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

"مسلمان ایک مسلمان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک دیوار جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تقویت پہنچاتی ہے۔" (حدیث)

اس پورے اسلامی معاشرہ کو ایک جسم سے تشبیہہ دی گئی اور اس کے تشکیل کرنے والے اجزاء کو اس جسم کے اعضا کی حیثیت دی گئی جو اس جسم کے تمام احساسات میں برابر کے شریک ہیں۔

"مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت، آپس کی دردمندی اور آپس کی ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم ہو کہ اس کے اگر کسی ایک عضو میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے" (حدیث)

اس معاشرہ اور اس قومیت نے جب ایک ریاست کی شکل اختیار کی تو ان لوگوں کے لیے جن کو اس کے اندر مکمل شہریت کے حقوق حاصل ہوئے۔ مسلم کا لفظ استعمال ہوا۔ مسلم کا لفظ قرآن اور حدیث میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک خدا اور رسول کے کامل فرمانبردار کے معنی میں دوسرے ایک اسلامی ریاست کے شہری کے لیے۔ عام اس سے کہ وہ صرف ظاہر میں اسلام کو مانتا ہے یا دل سے بھی اس کو مانتا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم (اسلامی ریاست کا شہری) ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو چکا ہے تو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغابازی نہ کرو۔"

(بخاری باب فضل استقبال القبلہ)

میمون بن سیار نے انس بن مالک سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ آدمی کے جان و مال کو کیا چیز محترم بناتی ہے؟
انھوں نے جواب دیا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرے،
ہمارے طریقہ پر نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلم (اسلامی ریاست کا شہری) ہے۔ اس کو مسلمانوں
کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں ہوں گی۔ (بخاری باب مذکور)

اس اسلامی ریاست میں ایک مسلم کا تو یہ درجہ قرار پایا کہ اگر وہ حکومت کا صدر یا خلیفہ بن جائے تو خواہ کسی ذات برادری، کسی نسل و نسب، اور کسی ملک وطن سے تعلق رکھتا ہو۔ معروف میں اس کی اطاعت واجب ہوگئی۔ برعکس اس کے ایک غیر مسلم کو یہ حیثیت کسی حال میں بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ فرمایا:

"سنو اور مانو اگرچہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے جس کا سر منقی جیسا ہو۔"

اسلام کے بنائے قومیت ہونے کا راز ان واضح اور قطعی دلائل کے بعد کسی شخص کے لیے یہ کہنے کی گنجائش تو باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام کے سوا کوئی اور چیز ہے۔ البتہ ایک خام ذہن میں یہ شبہ ممکن ہے پیدا ہو کہ یہ اسی طرح کا ایک مذہبی تعصب ہے جیسا کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے اندر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے نظام اجتماعی کا تصور نہیں کرسکتے جس میں ان سے مختلف عقیدہ و مسلک رکھنے والے بھی مساوی حیثیت سے حصہ دار ہوسکیں۔ اس زمانہ میں چونکہ مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا تصور ذہنوں پر پوری طرح مستولی ہوچکا ہے اس وجہ سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ بہت سے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار رہیں۔ اس سبب سے ضروری ہے کہ ہم اس کے اصلی اسباب واضح کردیں۔ ہمارے نزدیک اس کے خاص سبب تین ہیں۔

ایک سبب اس کا یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں دین اور دنیا یا مذہب اور سیاست کا الگ الگ کوئی تصور نہیں ہے اس نے ہماری زندگی کے کسی گوشہ کو بھی، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی آزاد نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے جس طرح ہماری شخصی زندگی سے متعلق احکام دئیے ہیں اسی طرح ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق بھی احکام دئیے ہیں اور خاص شرائط کے پیدا ہوجانے کے بعد ان کی تعمیل کا بھی اسی طرح مطالبہ کیا ہے جس طرح شخصی زندگی سے متعلق احکام و قوانین کی تعمیل کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک ایسا

مذہب جس کا مزاج اس طرح کا ہمہ گیر اور کلیت پسند ہو اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ قومیت کی اساس اپنے سوا کسی اور چیز کو بننے دے۔ اگر اجتماعی زندگی کی تشکیل کسی اور اصول پر ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قوم کا اجتماعی وجود ان احکام سے بغاوت کرے جو اسلام نے اجتماعی زندگی سے متعلق دئیے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان عقائد اور اصول کے اختلاف کے سوا ہر اختلاف کو غیر عقلی اور غیر فطری قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو بالکل احمقانہ قرار دیتا ہے کہ ایک ہی آدم کی اولاد میں محض اس بنا پر فرق کیا جائے کہ ایک شخص کالا ہے، دوسرا گورا ہے، ایک شخص جرمن نسب سے تعلق رکھتا ہے دوسرا اطالوی نسب سے۔ ایک شخص ترکی بولتا ہے، دوسرا عربی بولتا ہے یا ایک شخص ایک خاص سرزمین پر پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس سرزمین پر نہیں پیدا ہوا ہے۔ آخر ایک ہی آدم و حوا کی اولاد میں، ایک ہی سے عقلی اور فطری مطالبات رکھنے والوں میں، ایک ہی سے میلانات و جذبات کے حاملوں میں اور ایک ہی سے انفرادی و اجتماعی تقاضے محسوس کرنے والوں میں محض ایسے ظواہر کی بنا پر کیوں فرق کیا جائے جو یا تو اتفاقی ہیں یا جن کا تعلق محض آب و ہوا سے ہے؟ انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایک عقلی ہستی رکھتا ہے اور فاطر کی طرف سے ایک خاص فطرت لے کر آیا ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کی عقل و فطرت کا بالکل صحیح مظہر ہے، اس وجہ سے جو لوگ اس کو مانتے ہیں ان کو تو وہ صراط مستقیم پر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس کو نہیں مانتے ان کو صراط مستقیم سے منحرف قرار دیتا ہے۔ ان کے متعلق اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنی فطرت کے باغی اور اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے پیرو ہیں اس وجہ سے اسلام ان تمام لوگوں کو تو بلا لحاظ نسل و نسب اور بلا امتیاز زبان و وطن باہم دگر جوڑتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے تسلیم کرتے ہیں اور ان لوگوں کو اس قومیت سے الگ رکھتا ہے جو اسلام کو نہیں مانتے۔ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان صرف اسی ایک تفریق کو صحیح اور عقلی قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بنیادوں پر وہ ہر جمع بالتفریق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ قومیت کے جو معروف عوامل ہیں یعنی نسب یا وطن وغیرہ ان کے جو فطری حقوق ہیں وہ تو، جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اسلام نے بہتر سے بہتر طریقے پر خود پورے کر دئے ہیں۔ وہ سارے حقوق خود اسلام کا جزء بن چکے ہیں اور ایک سچے مسلمان کے لیے ان کا ادا کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح روزے نماز کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اب اس سے زیادہ جو لوگ ان چیزوں کو اہمیت دینا چاہتے ہیں یا دیتے ہیں وہ درحقیقت نسل یا وطن کے کسی فطری تقاضے کو نہیں پورا کر رہے ہیں بلکہ وہ ان کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو ان کے نہیں ہیں بلکہ خدا کے لیے خاص ہیں۔ ان چیزوں کو قومیت کی بنیاد تسلیم کر لینے سے نوع انسانی مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں بلا کسی سبب معقول کے تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر تعصبات اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں، عداوتیں اور دشمنیاں ہوتی ہیں۔ ہر قوم کی قومیت اور اس کی وطن دوستی کا یہ لازمی تقاضا بن جاتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے لڑے ہر نسل اس بات کو ایک فریضہ قومی سمجھتی ہے کہ وہ دوسری نسل پر اپنا تفوق جتائے۔ ہر زبان کے بولنے والے اپنا یہ پیدائشی حق جتاتے ہیں کہ ان کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے منظم ہونے کا موقعہ ملے اور دریا اور پہاڑ کی سرحد فاصل صرف زمین کے دو ٹکڑوں ہی کے درمیان حد فاصل نہیں رہتی ہے بلکہ وہ انسانوں اور انسانوں کے درمیان بھی ایک حد فاصل بن جاتی ہے۔ اسلام ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے وہ انسانوں کو کاٹنے نہیں بلکہ جوڑنے آیا ہے۔ پھر وہ کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ محض وہمی اور خیالی تعصبات کی بنا پر دنیا میں یہ فساد فی الارض برپا رہے۔ اس وجہ سے وہ انسانیت کی تنظیم کے لیے نہایت اعلے عقلی اور فطری اصول دیتا ہے اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نسل و نسب اور زبان اور وطن کی تمام تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر ان اصولوں پر مجتمع ہوں تاکہ خدا کی زمین پر بے شمار چھوٹی چھوٹی لڑنے والی ٹولیوں کی جگہ ایک ایسا گھرانا آباد ہو جائے جس میں خدا کی ساری مخلوق اور آدم کی پوری نسل سما سکے۔ صرف وہی اس سے الگ رہ جائیں جو نسلی اور وطنی تنگ نظریوں کے مریض اور اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انسانیت کے وسیع مفادات کے دشمن ہوں۔

اسلامی قومیت اور غیر مسلم | اب تفصیل سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ غیر مسلم اسلامی قومیت کا

کوئی جز نہیں بن سکتا۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس تفریق کا باعث کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قومیت کے ان وسیع تصورات کو جو اسلام پیش کرتا ہے، اپنانے کے بجائے ایسے محدود تصورات پر اصرار کرتے ہیں جن سے امن و سلامتی کے بجائے زمین میں ہمیشہ فساد برپا رہے۔ اسلام ان کو نسل و نسب اور ملک و وطن کی تنگ نالیوں سے نکال کر وحدت اللہ، وحدت آدم اور وحدت فطرت انسانی کے عالمگیر اصولوں پر لانا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنی تنگ نظریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ بجائے اس کے کہ ان کی خاطر اپنے آپ کو ان تنگ نظریوں میں گرفتار کرا دے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر غیر مسلم اسلامی قومیت کا جز نہیں بن سکتے تو ایک اسلامی نظام میں ان کے لیے کون سی جگہ ہے۔ اس سوال کا جواب ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس سلسلہ کے ایک دوسرے مبحث میں دیا ہے[1]۔ وہاں ہم نے نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ غیر مسلم اگرچہ اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں ہیں لیکن اسلامی نظام میں ان کے لیے نہایت باعزت جگہ محفوظ کر دی گئی ہے۔

[1] یہ مبحث ایک رسالہ کی شکل میں چھپ کر "غیر مسلموں کے حقوق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

(بقیہ اشارات)

اس لیے فاقہ مست ہیں کہ ان کے ہاں اولاد زیادہ ہوتی ہے اور قدرت کے ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے ان کی کفالت نہیں کر سکتے۔ یہ چال بڑی کارگر ثابت ہوئی اور لوگوں نے معاشرے میں دولت کی بہتر اور عادلانہ تقسیم کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اولاد کو گھٹانے کے منصوبے بنانے شروع کئے۔

علم معیشت کا اس وقت سب سے اہم مسئلہ پیدائش دولت کا مسئلہ نہیں بلکہ تقسیم دولت کا مسئلہ ہے۔ یہ بات موجب حیرت ہے کہ زمین ہر سال لاکھوں ٹن زائد غلہ اگلتی ہے مگر بے شمار لوگ نان جویں تک سے محتاج رہتے ہیں۔ فراوانی کے اس دور میں کمیابی، دولت و ثروت کے اس عہد میں یہ غربت و افلاس اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نقص پیدائش میں نہیں بلکہ تقسیم میں ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جب کبھی بہتر اور عادلانہ تقسیم کا سوال پیدا ہوگا تو اس کے ساتھ معاشرے کی تعمیر نو کا مسئلہ بھی خود بخود ابھرے گا۔ سرمایہ داروں کو چونکہ اس حقیقت کا علم ہے کہ لوگوں نے اگر اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا تو یہ ان کی موت ہوگی، اس لیے انھوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی ہے کہ عوام کے غیض و غضب کو یا تو خود ان پر الٹا دیا جائے یا اسے قدرت کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس طرح خود ان کی عیاشیوں میں فرق نہ آنے پائے۔

دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم پر بے جا اصرار کے جو برے ثمرات فاشزم اور کمیونزم کی شکل میں یورپ میں پیدا ہو چکے ہیں، کیا اہل پاکستان بھی انہیں سے جھولی بھرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح فساد کے اصل مرکز کی طرف توجہ کر کے اُسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ جبر و استبداد کے یہ سیلاب نہ تو کبھی پہلے ان کمزور فلسفوں کے سہاروں پر رکے ہیں، نہ اب یہ گمراہ کن نظریات انہیں روک سکتے ہیں۔

فاقہ مستی سے بچنے کے اس نسخہ کیمیا نے یورپین اخلاق کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس سے اباحیت مطلقہ (صنفی انارکی) کو سہارا ملا۔ یورپ کی سرزمین جس میں شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ہر قسم کے سامان موجود ہیں وہاں اگر کوئی ڈر عورت کو زنا سے باز رکھ سکتا ہے تو وہ حمل کا خوف ہے

قدرت کا یہ پاسباں ہر صنفِ نازک کی عفت و عصمت کی بے مزد حفاظت کرتا ہے۔ ضبط تولید کے ذریعہ جب اس خوف کو ختم کر دیا گیا تو پھر صنفی انارکی کا وہ طوفان اٹھا کہ جس کی مثال تاریخ انسانی میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ نکاح کے بندھن بڑی سرعت کے ساتھ ٹوٹنے لگے کیونکہ اب آزاد شہوت رانی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہ رہی۔ اور اس طرح دیکھتے دیکھتے یورپ کا ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر کوارٹر عصمت فروشی کا اڈہ بن گیا۔

اس کے علاوہ جو قومیں ایک دفعہ اس چکر میں گرفتار ہوئیں وہ ہزار کوششوں کے بعد اس سے نجات حاصل نہ کر سکیں۔ ضبط تولید کی وجہ سے جرمنی اور فرانس کی آبادی میں معتدبہ کمی ہوگئی۔ یہ چیز ان کے لیے جنگ کی صورت میں بڑی خطرناک تھی۔ چنانچہ اس کو ختم کرنے کے لیے بے شمار تدبیریں عمل میں لائی گئیں۔ غیر شادی شدہ لوگوں پر بھاری ٹیکس عائد کیے گئے، کثیر الاولاد لوگوں کو مختلف قسم کے وظائف دیے جانے لگے۔ مگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی حالات کسی طرح سنبھلنے نہ پائے اور یہ چیز ان دونوں اقوام کو لے ڈوبی۔

کیا پاکستان کے ارباب بست وکشاد اس ملک کو انہیں خطرناک راہوں پر ڈالنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ایک طرف ان کی سرحد کے اس پار ایک ایسا معاند ملک ہے جس کی آبادی پاکستان کی آبادی سے چار گنی سے بھی زیادہ ہے۔ دوسری طرف یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی آبادی جتنی ہے اس سے بھی کم ہو جائے۔ اس صورت میں کیا پاکستان کے ارباب اقتدار اس ملک کا حشر فرانس سے بھی بدتر کر دینا چاہتے ہیں۔

مطبوعات

زرِگل | نتیجۂ فکر: کوثر نیازی صاحب ۔ شائع کردہ: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، قیمت دو روپے بارہ آنے

کوثر نیازی نوجوان شعرا کے اس زمرے سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی اور انسان کا مطالعہ اسلامی نظریات کی روشنی میں کرتا ہے اور اپنے تخلیقی رجحانات کو تعمیر پسندانہ ذوق کی رودگاہوں میں بہاؤ کا موقع دیتا ہے۔

کوثر صاحب کی شاعری کے نخلِ شاداب سے ابتدائی کونپلیں بھی میرے سامنے پھوٹیں، پھول بھی میرے سامنے کھلے اور ان پھولوں میں سے کوثر صاحب نے زرِگل بھی میرے سامنے ہی چُنا۔ جیل کا دور بیشتر اکٹھے ہی گذارا۔ ایک ہی کوٹھڑی میں پاس پاس کے بستروں پر ہوتے ہوئے کبھی مجھ پر، کبھی اُن پر کیفیتِ شعری طاری ہوتی۔" گم بخویشتن ہونے کا یہ عالم کچھ دیر رہتا، پھر گنگناہٹ سنائی دیتی، پھر تازہ حاصلِ کاوش بڑے شوق سے سنا سنایا جاتا۔ اب اس دلی قربت کے ہوتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ کوثر صاحب پر میں تنقید کروں تو وہ کیسے کامیاب رہے گی اور میں ان کی تعریف کروں تو یہ اپنی ہی تعریف زیب کیسے دے گی۔

تاہم ادائے فرض کے طور پر یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو "فن برائے فن" کے قائل ہوں یا جو زندگی کے عظیم فرائض سے بھاگ کر لذتیت کے میکدے میں اک گونہ بیخودی حاصل کرنا چاہتے ہوں ۔ کوثر زندگی کا شاعر ہے، حقیقت واقعیت، کا شاعر ہے اور کوثر انسانیت کا شاعر ہے اس کی شاعری کے آئینہ میں عالمِ انسانیت کے مسائل منعکس نظر آتے ہیں۔ وہ بھی ان مسائل کو اسلامی زاویوں سے دکھاتا ہے اس کے شعر میں فکری وجذباتی ہر دو لحاظ سے اسلام کی روح رچی بسی ہے مگر اس کے ہاں وعظ اور فلسفے کا رنگ نہیں، تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مقصدیت کے ساتھ تغزل کے اس رنگ کو مختلف تاسیوں اور مختلف ترکیبوں میں استعمال کرنے کے چند تجربے ہیں جو زرِگل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے بعض تجربے اتنے کامیاب ہیں کہ آدمی جھوم جھوم اٹھتا ہے اور جہاں شاعر ناکام رہا ہے وہاں بھی مایوسی نہیں ہوتی۔ ص

ص مکتبۂ تعمیرِ انسانیت نے بڑے اچھے معیار کے ساتھ کوثر صاحب کے اولین مجموعہ کلام کو شائع کیا ہے۔

خـــالی صفحـــه

مخلوط انتخاب کے انتشار انگیز نعروں

نے پاکستان کی جد و جہد میں اپنی جان ۔ مال اور آبرو کی قربانی دینے والے لاکھوں مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا مسلمانوں کا تہذیب و تمدن دوسری تہذیبوں سے کوئی جداگانہ نوعیت نہیں رکھتا اور کیا پاکستان کے حصول کے لئے ساری قربانیاں بیکار نہیں تھیں ۔ اگر مسلمانوں کے تصور زندگی اور غیر مسلموں کے تصور زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پاکستان میں بھی اسلام کو اجتماعی نظام کی حیثیت سے اس لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم اسے پسند نہیں کرتے ۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نہایت تفصیل کے ساتھ اسلامی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے تمیز کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلامی تہذیب کے مآخذ دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں سے قطعاً مختلف ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہ قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ اختیار ہی کیا جا سکتا ہے ۔ جب تک کہ ان بنیادوں کو تسلیم نہ کیا جائے جن پر اسلامی تہذیب کی عمارت استوار کی گئی ہے ۔ دیدہ زیب گرد پوش اور مضبوط جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے ۔

تاریخ کا کوئی دور ہو

پتھر کا زمانہ ہو یا ایٹم کا دور

اسلام

ہر دور میں ایک نہایت کامیاب اجتماعی نظام کی حیثیت سے چل سکتا ہے کیونکہ اس کے اصول انسانی فطرت کی بنیاد پر قائم ہیں اور الہامی ہدایات کی روشنی سے منور ہیں ۔

تنقیحات

میں مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف علمی ۔ سیاسی ۔ معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں اتنی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ حل کیا ہے کہ نہ صرف مختلف گتھیاں سلجھ گئی ہیں بلکہ اسلام کی انقلاب انگیز دعوت بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے ۔ خوبصورت گرد پوش اور مضبوط جلد ۔ قیمت ساڑھے تین روپے ۔

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان ۔ اچھرہ ۔ لاہور

پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور